جلد ۹۳ | اگست ۱۹۸۰ء | عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

حقیقتِ جہاد

○ جہاد ○ جہاد کی اہمیت

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

☆ سفید کاغذ ☆ آفسٹ طباعت ☆ رنگین کور

قیمت ـــــــ ۲/- روپے

اِدارۂ ترجمانُ القرآن، اچھرہ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۳ | اگست ۱۹۸۰ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ | عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر — ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۰۳۱۶

زر سالانہ بیس روپے - فی پرچہ ۲/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس معاشرے میں آدمی خدمتِ دین کر رہا ہو، اُسے ہر پہلو سے اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ بیج ڈالنے والے کسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کھیتی کیسی ہے؟ اس کے زرخیز قطعات زیادہ ہیں یا بنجر؟ اور وہ کہاں کہاں ہیں؟

ہمارا موجودہ معاشرہ دولت پرست اور اسراف پسند معاشرہ ہے۔ ترقی کے نام سے معیارِ زندگی کو بڑھانے کی جو دوڑ دنیا بھر میں لگ رہی ہے، اس سے اہلِ پاکستان کا پہلے زیادہ تعلق نہ تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد یہ رَو ہلکی ہلکی محدود دائروں میں شروع ہوئی، ۱۹۶۲ء کے بعد یہ قدرے تیز ہو گئی اور اس کا دائرہ بھی پھیل گیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے تو یوں سوچا جاتا تھا کہ کون سے لوگ اس وبا میں مبتلا ہیں، اب دل درد مند رکھنے والے عناصر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کون سے لوگ اس سے محفوظ ہیں، —— پورے محفوظ نہ سہی، واجبی حد تک!

مگر اب یہ طوفان کُوبہ کُو اور گھر بہ گھر دندنا رہا ہے۔ ہر سطح کے گھروں اور افراد کے سامنے قطعۂ زمین، مکان یا کوٹھی، اسکوٹر یا کار، ٹیلی وژن اور فرج، ایئر کنڈیشنر اور کپڑے دھونے کی مشین، قالین اور فرنیچر، جدید چولہے اور ہیٹر، گدے دار پلنگ اور دروازوں کھڑکیوں کے پردوں کی بے حساب خواہشات کی لمبی فہرست ہے اور وہ ان میں سے باری باری ایک ایک چیز کے حصول کو منزل بنا کر دوڑ لگا رہا ہے۔ اس دَور میں ہانپتے ہوئے وہ دینی عبادات و شعائر،

خاندانی روایات، مہذبانہ اقدار، درخشاں اخلاقیات کے معیاری خزانوں کو اس لیے پھینک رہا ہے کہ یہ دوڑ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز سے بے نیاز ہو کر ہر قیمت پر روپے کو حاصل کرنا اور آمدنی کو بڑھانا چاہتا ہے۔ رشوت ہو کہ اسمگلنگ، ملاوٹ ہو کہ بھاری منافع اور گراں فروشی، قومی املاک میں خیانت ہو یا عام امانات میں خورد برد ـــــ اور ان چیزوں سے آگے بڑھ کر چوری، لوٹ مار، جیب تراشی، سڑکوں پر بسیں روک کر ڈاکہ زنی، شرکاروں کے لیے بچوں کا اور جنسی گندگی پھیلانے والوں کے لیے عورتوں کا اغوا، اور سب سے بڑھ کر قتل۔ یہ سارے جرائم لوگوں کو پسند آ رہے ہیں۔ دیدہ دلیری کی حد یہ ہے کہ نہ صرف سرکاری کاغذات کے اندراجات سے بے پروا ہو کر پلاٹوں اور عمارتوں پر قبضے جمائے جاتے ہیں، دکانوں اور مکانوں کو کرایہ پر دینے کے لیے ہزاروں روپے کی پگڑیاں وصول کی جاتی ہیں بلکہ صدہا واقعات ایسے ہیں کہ ایک شخص کسی دوسرے کی زمین کو اسی کے نام فروخت کرتا ہے اور خود عدالت میں جا کر رجسٹری کراتا ہے اور اسے گراں بہا رقم مفت میں ہاتھ آ جاتی ہے۔ بچے امتحانات کے کمروں میں نگرانوں کی آنکھوں کے نیچے نقل کرتے ہیں، کتابیں اور نوٹس یکے بعد دیگرے منتقل ہوتے ہیں اور جرم و خیانت کی قوت اتنی زبردست ہے کہ کوئی دم نہیں مار سکتا۔ رہی سہی کسر طلبہ کے والدین اور سرپرست اپنے محبوں اور دوستوں کی مدد سے پوری کرتے ہیں۔ وہ پرچوں کا باقاعدہ تعاقب کرتے ہیں اور نمبر لگانے والے ممتحنوں کو سفارش یا رشوت یا دھمکی کے بل پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کے فیل ہونے والے بچے کو فرسٹ کلاس کے پاس نمبر دیں۔ اس سطح پر کام نہ بنے تو پھر اگلی منزل ہیڈ ایگزامینر ہوتے ہیں۔ وہاں کوئی مشکل ہو تو نتیجہ مرتب کرنے والے عملے سے گٹھ جوڑ کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو جعلی ڈگریوں اور ڈپلوموں کا دروازہ اسی طرح کھلا ہے جیسے جعلی پاسپورٹوں اور ویزوں اور سرٹیفکٹوں کا۔

پھر ایک بلا یہ نازل ہوئی ہے کہ کچھ تو کاریگروں اور مزدوروں کی کمی کی وجہ سے اور کچھ یہ دیکھ کر کہ اُن کے بھائی بند چند سو میل کی دوری پر اُن سے چار گنا کمائی کر رہے ہیں انہوں نے اپنے نرخوں اور اجرتوں میں بھاری اضافے کر دیے ہیں۔ ایک پلمبر پندرہ منٹ میں اور ایک بجلی کا اناڑی مستری ایک گھنٹے میں اتنا کما لیتا ہے جتنا تعلیم یافتہ لوگ دو تین گھنٹوں میں، لیکن ستم یہ کہ کام چوری

اور کام میں نالائقی اور خیانت کاری مزید بڑھ گئی ہے۔ کارخانوں میں مزدور اور دفتروں میں بابو نہ پوری حاضری دیتے ہیں، نہ پورا اور معیاری کام کرتے ہیں مگر تنخواہوں اور اجرتوں کے اضافے کے لیے سراہ تیار۔ درحقیقت یہ ایک بہت ہی وسیع سلسلۂ خیانت ہے۔

خدا کے کچھ نیک دل اور شریف بندے اگر اچھے اصول و اخلاق کے تحت ان مفاسد سے پرہیز کر کے نقصان اُٹھاتے ہیں تو سارا معاشرہ اب انہیں اگلے وقتوں کے بیوقوف سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود اُن کے بیوی بچے بھی ایک نہ ایک دن انہیں اپنی اس رائے سے آگاہ کر دیتے ہیں کہ تم نے اپنے خیالی اصولوں اور بے فیض اخلاقیات کی وجہ سے ہم سب کو پسماندگی میں جھونک دیا ہے۔ وہ چند گھرانے بڑے عظیم ہوں گے جن کی خواتین اور بچے گھروں کے سربراہوں کے ایمان و اخلاق پر "ترقی" میں حائل ہونے کے باوجود راضی ہوں۔ معاشرے کی اصل دینی قوت ایسے ہی گھرانوں میں جڑیں رکھتی ہیں۔

اِس آگ کو "دوبئی ازم" نے اور بھڑکا دیا ہے۔

دوبئی ازم سے میری مراد کوئی خاص ملک نہیں ہے، بلکہ وہ دوبئی ہو یا سعودی عرب، ناروے اور بلجیم ہوں یا برطانیہ اور امریکہ "دولت پرستوں" کے یہ یکساں متبرک مقامات ہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک دوڑ لگ رہی ہے۔ گاؤں یا محلے کا ایک شخص جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد جب روپیہ اس کے گھر میں ناچنے لگتا ہے تو اڑوس پڑوس میں مائیں اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو باہر جانے کی اس طرح تلقین کرنے لگتی ہیں جیسے سچے مسلم معاشرے کی مائیں جہاد اور ہجرت اور حج کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ اُس کے کانوں میں ڈالنے لگتی ہے کہ تم بڑے ہو کر باہر جاؤ گے اور سارے گھر کو دولت سے بھر دو گے۔ بعید نہیں کہ اب ایسی لوریاں رواج پا جائیں جن میں معصوم جانوں کی لوح سادہ پر یہ نقش خوب گہرا کر دیا جائے کہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد دولت کمانا ہے اور دولت کمانے کے لیے دوبئی اور ابوظہبی، یا برطانیہ و امریکہ جانا واجب ہے۔

دُنیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روپیہ کمانا، یا معاشی تگ و دو کے لیے ملک سے باہر جانا ممنوع نہیں ہے۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ جانے والے ایک نو مغربی کلچر کے کالبد سے گزر کر آتے ہیں اور بیرونی سامانوں کے ساتھ وہاں سے آداب و شعائر بھی ساتھ لے آتے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے معاشرے کی سطح

سے کئی گنا زیادہ کمائی کرنے کی وجہ سے باہر کی مسرفانہ زندگیاں گزار کے آتے ہیں تو یہاں بھی ان کا ذہن اور ان کا وافر روپیہ اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے سامنے خوب خراج بن کر دکھائیں اور فخر کریں۔ بلکہ بعض بے صلاحیت لوگ باہر جھاڑو سے کر کام چلاتے ہیں، اور کھانے لباس اور رہائش میں انتہائی کنجوسی کر کے گھٹیا زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ بھی واپس آ کر اپنے ماحول میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ دکھلاتے ہیں، جیسے کہ جناب سونے کی کان سے مال نکال لائے ہیں۔ ان کے سامنے آنے والے گھر سجنے والے سامان، مشینیں اور الیکٹرانکس اُن کے اپنے اور بیگمات اور بچوں کے زرق برق ملبوسات اور دکانوں پر اُن کی والہانہ خریداری کثیر تعداد کو مبہوت کر دیتی ہے۔ قسائی کے ہاں گئے تو دس سیر گوشت کا آرڈر دیا۔ پھل والے کے ہاں پہنچے تو پانچ منٹ میں سو روپے کا پھل اٹھوا لیا۔ زمین کا پلاٹ خریدنے نکلے تو بھاری سے بھاری قیمت بآسانی ادا کرنے کو تیار۔ تعمیر شروع کرائی تو لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے، کوئی تقریبِ گھر میں ہوئی تو گویا عباسی دور کے دربار شاہی کا کوئی جشن منعقد ہو گیا۔ ضروریاتِ زندگی کے تیزی سے مہنگا ہونے کی وجہ نہ صرف افراطِ زر ہے بلکہ زیادہ مؤثر وہ مسرفانہ رویّہ ہے جو دوبئی اور امریکہ سے آنے والا روپیہ پیدا کرتا ہے۔ ان حضرات کے اعزاز کے لیے ہوائی اڈوں پر ٹیکسیوں کے کرایے تگنے چوگنے ہو گئے اور معاً مقامی لوگوں کو بھی یہ نیا بوجھ اُٹھانا پڑا۔ یہ بوجھ ایک ہی مد میں نہیں، ہر مد میں اسی طرح باہر جانے والوں پر لد گیا ہے۔

ایسے مضحکہ انگیز واقعات میرے سامنے ہیں کہ کسی کو رہ میں ٹیلی وژن لگا ہے اور اس کے لیے بجلی جنریٹر سے پیدا کی جاتی ہے۔

ایک شخص ان پڑھ بھائی یا بیٹے کے لیے گھڑی بھیجتا ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ بیٹری والی نئی گھڑی کے ڈائل کو اچھی طرح پڑھ سکے۔ گڈریا بکریاں چرا رہا ہے اور چار بینڈ کا ریڈیو کیکر کی جھاڑیوں میں رکھ کر ایسے نغمے سن رہا ہے جن کو وہ سمجھ نہیں سکتا۔ بوڑھی نانیوں اور دادیوں کی کلائیوں پر گھڑیاں بندھی ہیں۔

کیا یہ دولت جیسی نعمتِ خداوندی کے ساتھ مذاق نہیں ہے۔

وجہ خرابی یہ بھی تو ہے کہ کم تعلیم یافتہ (بلکہ ان پڑھ) اور کم صلاحیت کے لوگ چار چار سال میں دس

مالی سطح پر جا پہنچے جہاں یہاں کے قابل حضرات مدتوں میں نہ پہنچ سکے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نئی قسم کے نودولتیوں کی کلاس ہے۔ اور اس نے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اس نے دولت پرستی اور اسراف پسندی کی وبا کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ یہ کلاس ہوائی جہازوں میں سفر کرتی ہے اور بیشتر سیٹیں اسی کے پاس ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو یہاں لائیں تو کنڈر گارٹن اور انگلش میڈیم سکولوں اور کالجوں میں داخل کراتے ہیں۔ ان کی خواتین تک یہاں کی عورتوں پر گرفت کرتی ہیں کہ "باہر کا کپڑا" تو ہے نہیں ----------، کم درجے کے لوگ جب بھی گھر آتے ہیں تو ہر دفعہ ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو گرام، ہنرموس، کیمرے وغیرہ ساتھ لاتے ہیں۔ کوئی چیز پاس رکھی، کسی کو بیچ کر خاصی کمائی یہاں کر لی۔ بڑے لوگ کاریں، فریج، ٹیلی وژن، ٹرک، ٹریکٹر، منی بسیں، بڑی بسیں، کپڑے دھونے کی مشینیں ساتھ لاتے ہیں اور اپنی دولت کی قوت سے یہاں کے پرانے کاروباریوں کے مقابلے میں میدان میں آجاتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ کتنا زرمبادلہ ہر سال پاکستان کے بجائے دوسروں کی جیب میں جاتا ہے۔ یہی اگر ہمارے پاس رہے تو دفاع یا صنعت و زراعت میں کتنی تیزی سے ترقی ہو سکتی ہے۔ انڈیا کے لوگ بھی ہم سے زیادہ ہی باہر کمائی کرتے ہیں مگر حکومت کی طرف سے اجازت نہیں کہ وہ ہر بار جدید قیمتی سامانوں سے لدے پھندے ملک میں داخل ہوں۔

میں معذرت کرتا ہوں کہ جس طرح ملک کے اندر کے لوگ میرے بھائی ہیں، اسی طرح مجھے باہر جا کر معاشی تگ و دو کرنے والے بھی عزیز ہیں۔ میں دونوں کا احترام کرتا ہوں۔ مگر ایک خاص صورت حال کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں اُن پر بحث کیے بغیر ہم اپنی فلاح و بہبود پر غور ہی نہیں کر سکتے بخصوصاً دین کی خدمت کرنے والے لوگ اپنا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے۔

ہمارے موجودہ دولت پرستانہ ماحول میں یہ حقیقت کسی کو یاد ہی نہیں کہ دولت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور جسے کمانے اور خرچ کرنے کا یہ اصول نہیں کہ جیسے جی چاہے ---- اس حقیقت کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے اسراف پسندانہ رجحانات زور پکڑ گئے ہیں۔

لباسوں خصوصاً خواتین کی ساڑھیوں اور غراروں، بیل باٹم اور دوسرے ملبوسات کا اسراف یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ کسی زنانہ ادارے میں چلے جائیے تو معلوم ہوگا کہ فاخرہ لباسوں کا کوئی مقابلہ ہو

رہا ہے۔ راہ چلتی خواتین کی بیشتر تعداد کو دیکھ کر بھی یہی گمان گزرے گا کہ کسی مینا بازار کو جا رہی ہیں۔ پھر فیشنوں کا برسات کے موسم کی طرح نت نئے رنگ بدلنا، پھر آرائش کے سامانوں کا استعمال اور خضاب اور مصنوعی چوٹیوں اور سو سو روپے تک کی فیس دے کر بال ترشوانا اور آرائشِ گیسو کرانا ــــ ان چیزوں کی مدد سے ۵۰ برس میں ۲۵ برس کی عمر کا سماں پیدا کر لیا جاتا ہے۔ دھیان ادھر ہے ہی نہیں کہ سامنے ایک قبر تیار ہو رہی ہے اور موت اس کے دروازے سے جب عالمِ آخرت میں لے کے جائے گی تو اسے نہ عمر کے بارے میں کوئی مغالطہ ہوگا، نہ صحت کے متعلق ــــ سامانِ آرائش ــــ پوڈر، کریمیں لپ اسٹکس، فحش قسم کی انگیائیں ربربسٹرز، ابرو منڈوا کر .... اپنے پسندیدہ رنگ سے حسبِ منشا طوالت اور خم رکھنے والے ابرو بنانے کی پنسلیں۔ موڈیلٹی تو لیے، ازالۂ موئے نامطلوب کی کریم اور لوشن، رنگ کو گورا کرنے کے لیے ضمادیات، بالوں کے شمپو وغیرہ کا کاروبار زوروں پر ہے ــــ ان آرائشی اور فیشنی چیزوں کی ایک دکان پر چند سال پہلے میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ بھئی ساری دکان ان چیزوں سے بھر دی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی یومیہ بکری اتنی ہے کہ ہمارا کام خوب چلتا ہے۔ اور قیمتیں اتنی بھاری ہیں کہ خاصا منافع ملتا ہے۔

یہ سارا بوجھ خاوندوں یا باپوں اور بھائیوں کی آمدنیوں پر پڑتا ہے اور وہ بیچارے جب رزقِ حلال سے اسے پورا نہیں کر سکتے تو حرام کے راستوں سے حاصل کرتے ہیں۔

کپڑا خاص طور سے، اور دیگر اشیاء عام طور پر باہر کی خریدنا اور مہنگی قیمتیں ادا کرنا ایک عام وتیرہ ہے۔ باہر کے سامانوں کی باڑہ منڈیاں ایسے لوگوں کی پیاس بجھانے کو موجود ہیں جن کا اپنا کوئی آدمی باہر ملازمت کر کے ضروریات و لاضروریات کی فراہمی کرنے والا نہ ہو۔ ان منڈیوں میں بھی، اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی بسا اوقات پاکستان ہی کا بنا ہوا نفیس کپڑا اور دوسرا سامان جاپان اور امریکہ کی مہروں کے ساتھ فروخت ہوتا ہے اور غیر پاکستانی مصنوعات کے فدائی ایسی اشیاء کو بڑی ذہنی تسکین کے ساتھ خریدتے ہیں۔

کسی گھر میں چلے جائیے، صوفہ سیٹ سے کم درجے کا فرنیچر تو مشکل ہی سے کہیں ملے گا۔ کچی بستیوں تک میں ایسی چیزیں آپ دیکھیں گے کہ آپ کو پکے مکان میں حاصل نہیں۔ میں نہایت گندے گھروں کے بچوں کو جب تیز شوخ رنگوں اور غیر ملکی ڈیزائنوں کے کپڑے بھدے طریق سے پہنے ہوئے دیکھتا

ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے انہیں خیرات میں دیئے ہوں۔ کہیں اپلوں کے ڈھیر اور چولہے اور مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پاس ولایتی منظر موس پڑا ملے گا۔ اب یہاں کے نوجوانوں میں "جینز" پہننے کا رواج ہو چلا ہے۔ نیز ہمارے کارخانوں میں یہ کپڑا بننے لگا ہے۔ اس میں کوئی خوبی نہیں۔ صرف اسے پہننے سے یہ لذتِ فخر حاصل ہوتی ہے کہ تہذیب بدن پرست کے اُستادوں میں اس کا رواج ہو گیا ہے۔ پتلون پہننے والی خواتین بھی دیکھنے میں آئیں گی۔ واہ ری ترقی!

اگر صحیح معنوں میں آپ کو رفتارِ اسراف کا اندازہ کرنا ہو تو ایک تو اعلیٰ قسم کے سامانوں کی دکانوں اور سٹوروں پر بیٹھ کر اس قوم کا تماشا دیکھیے جسے اقبال نے پکار کر کہا تھا کہ:-

ع "تو کجا بہر تماشا می روی"۔ دوسرے کسی شادی یا سالگرہ کی تقریب میں شامل ہو کر اندازہ کیجیے کہ ہماری اقتصادی پسماندگی کا راز کیا ہے۔

پچاس پچاس جوڑے کپڑوں کے ـــــ اِدھر سے بھی اُدھر سے بھی ـــــ جن میں زیادہ تر "باہر کے" ہوں گے۔ ورنہ ناک کٹ سکتی ہے۔ جہازی سائز کے سنہرے اور قوس قزحی رنگوں میں چھپے ہوئے نقشیں عید کارڈ جن کے نیچے "بیگم فلاں" کا نام شانِ اولیت کے ساتھ لکھا ہوتا ہے، دس دس بارہ بارہ تولے سونے کا زیور۔ سو سو آدمیوں کی باراتیں، آٹھ آٹھ سو افراد کے ولیمے، مہمانوں کے لیے چار چار قسم کے شاہانہ کھانے اور پھر پھلوں کے ڈھیر، جن کا خاصا بڑا حصہ ضائع جاتا ہے، کوکا کولا کی ایک ایک ہزار بوتلوں کا صفایا۔ عظیم الشان مہر (جن کے ادا کرنے کی نوبت کم ہوتی ہے) لڑکی والوں سے بھاری جہیز کا مطالبہ۔ مطلوبہ اشیاء (فرج، ٹیلی وژن، سکوٹر وغیرہ) کی فہرست سامنے رکھ دینا۔ بلکہ یہ بھی چاہنا کہ باہر جا کر لڑکے کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات بھی دلہن والے ادا کریں، کیونکہ اُن کا قصور یہ ہے کہ وہ لڑکی والے ہیں۔ پھر طلے کے ہار، اور اُن کے ساتھ نوٹوں کے ہار، شامیانے اور سیکڑوں بلبوں کی روشنیاں۔ دولت کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ بدتوفیقی ـــ کہ ہزاروں روپے پھونکنے والے گھر میں مہمانوں کو بٹھا کر کھانا کھلانے کا انتظام نہیں۔ جگہ اور خرچ کے بہانے تو یونہی ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ "کلچرل فادر" کی پسند و ناپسند کا لحاظ ہوتا ہے۔

پھر شادی یا تقریب والے گھر میں عورتوں کے لباس و آرائش کا مینا بازار لگ جاتا ہے ـــ پردے کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں۔ کوئی پیچھے پردے والی اور نماز پڑھنے والی خاتون (باقی بر صفحہ ۳۹)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء

عَلَیہِمُ السَّلام

از

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب سوم ——— حضرت نوح علیہ السّلام

فصل ۱ تا ۲

وہ سورتیں جن میں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا ہے۔

سورۃ	آیت نمبر
یونس	۷۱ تا ۷۳
الاعراف	۵۹ تا ۶۴
الشعراء	۱۰۵ تا ۱۲۱
مومنون	۲۳ تا ۳۰
ہود	۲۵ تا ۴۱
عنکبوت	۱۴ - ۱۵
یٰسین	۴۱ تا ۴۴
الشوریٰ	۱۳
بنی اسرائیل	۳
مریم	۵۸
الانبیاء	۷۶ - ۷۷
الصّٰفّٰت	۷۵ تا ۸۲
الحج	۴۲
الفرقان	۳۷
الاحزاب	۷
ص	۱۲ اور ۳۱
القمر	۹
نوح	۱ تا ۲۸
الحدید	۲۶

فصل ا

قرآن میں قصۂ نوحؑ کا یکجائی بیان

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ	(اور ایسے ہی حالات تھے جب) ہم نے نوحؑ کو
قَوْمِهِ ۖ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ	اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ (اس نے کہا) "میں
مُّبِينٌ ۝ أَن لَّا تَعْبُدُوا إِلَّا	تم لوگوں کو صاف صاف خبردار کرتا ہوں کہ اللہ تم
اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ	کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو ورنہ مجھے اندیشہ ہے
يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝	کہ تم پر ایک روز دردناک عذاب آئے گا۔"
فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا	جواب میں اس کی قوم کے سردار، جنھوں نے
مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا	اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے "ہماری
بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ	نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو
اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ	ہم جیسے، بس اُن لوگوں نے جو ہمارے ہاں
أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ	اراذل تھے، بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی
وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا	اختیار کر لی ہے اور ہم کوئی چیز بھی ایسی
مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ	نہیں پاتے جس میں تم لوگ ہم سے کچھ بڑھے ہوئے
كَاذِبِينَ ۝	ہو، بلکہ ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔"
قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ	اس نے کہا "اے برادرانِ قوم، ذرا سوچو تو سہی
عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَ	کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت
آتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ	پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت
فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ	سے نواز دیا مگر وہ تم کو نظر نہ آئی تو آخر ہمارے

اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا	پاس کیا ذریعہ ہے کہ تم ماننا نہ چاہو اور ہم زبردستی
كٰرِهُوْنَ ۝	اس کو تمھارے سر چپیک دیں؟
وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ	اور اے برادران قوم میں اس کام پر تم سے
مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا	کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے۔
عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ	اور میں ان لوگوں کو دھکے دینے سے بھی رہا جنھوں
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا	نے میری بات مانی ہے، وہ آپ ہی اپنے رب کے
رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا	حضور جانے والے ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ
تَجْهَلُوْنَ ۝	جہالت برت رہے ہو
وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ	اور اے قوم! اگر میں ان لوگوں کو دھتکار دوں تو خدا
اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا	کی پکڑ سے کون مجھے بچائے گا؟ تم لوگوں کی سمجھ میں کیا
تَذَكَّرُوْنَ ۝	اتنی بات بھی نہیں آتی؟
وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ	اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے
اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ	خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں،
اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ	نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور یہ بھی میں
لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ	نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمھاری آنکھیں حقارت
لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ	سے دیکھتی ہیں انھیں اللہ نے کوئی بھلائی نہیں دی۔
اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ	ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے اگر میں ایسا
اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝	کہوں تو ظالم ہوں گا۔"
قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا	آخرکار ان لوگوں نے کہا: "اے نوحؑ! تم نے ہم
فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا	سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا۔ اب تو بس وہ عذاب
تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝	لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو اگر سچے ہو۔"
قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ	نوحؑ نے جواب دیا "وہ تو اللہ ہی لائے گا اگر
اللّٰهُ اِنْ شَاۗءَ وَمَآ اَنْتُمْ	چاہے گا، اور تم اتنا بل بوتا نہیں رکھتے کہ اسے روک دو

بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ
اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ
يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝
اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ
اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ
وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا
تُجْرِمُوْنَ ۝
وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ
يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ
اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا
يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ
بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِيْ
فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝
وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۫ وَكُلَّمَا مَرَّ
عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ
قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ
مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ
مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ
عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ حَتّٰٓى اِذَا
جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ
قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ
زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا

اب اگر میں تمھاری کچھ خیر خواہی بھی کرنا چاہوں تو میری
خیر خواہی تمھیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جبکہ اللہ
ہی نے تمھیں بھٹکا دینے کا فیصلہ کر لیا ہو وہی تمھارا
رب ہے اور اُسی کی طرف تمھیں پلٹنا ہے۔
اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس
شخص نے یہ سب کچھ خود گھڑ لیا ہے؟ ان سے کہو "اگر میں
نے یہ خود گھڑا ہے تو مجھ پر اپنے جرم کی ذمہ داری ہے، اور
جو جرم تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں"۔
نوح پر وحی کی گئی کہ تمھاری قوم میں سے جو لوگ
ایمان لا چکے ہیں بس وہ لا چکے، اب کوئی ماننے والا
نہیں ہے۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑو اور ہماری
نگرانی میں ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانی شروع
کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے اُن کے حق
میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا، یہ سارے کے سارے
اب ڈوبنے والے ہیں۔ نوح کشتی بنا رہا تھا اور اس
کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے
گزرتا تھا وہ اس کا مذاق اُڑاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر
تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں، عنقریب
تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے
جو اُسے رسوا کر دے گا، اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو
ٹالے نہ ٹلے گی"۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور
وہ تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا "ہر قسم کے جانوروں کا ایک
ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو، اپنے گھر والوں کو بھی سوائے

مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ
وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ وَقَالَ
ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرٖهَا
وَمُرْسٰهَا ۚ إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ
رَّحِيمٌ ۝ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ
فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى
نُوحُ ابْنَهُ وَكَانَ فِي
مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا
وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِينَ ۝ قَالَ
سَاٰوِيْ إِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ
مِنَ الْمَآءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ
الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ إِلَّا
مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ
بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ
مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ وَقِيْلَ
يٰٓأَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ
وَيٰسَمَآءُ أَقْلِعِيْ وَغِيْضَ
الْمَآءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ
وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ
الظّٰلِمِيْنَ ۝
وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ
رَبِّ إِنَّ ابْنِيْ مِنْ أَهْلِيْ وَإِنَّ

ان اشخاص کے جن کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔
اس میں سوار کرا دو۔ اور ان لوگوں کو بھی بٹھا
لو جو ایمان لائے ہیں۔" اور تھوڑے ہی لوگ
تھے جو نوحؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ نوحؑ نے
کہا "سوار ہو جاؤ اس میں۔ اللہ ہی کے نام سے
اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی، میرا رب
بڑا ہی غفور رحیم ہے۔" کشتی ان لوگوں کو لیے چلی
جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ
رہی تھی۔ نوحؑ کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوحؑ نے
پکار کر کہا "بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا، کافروں
کے ساتھ نہ رہ۔" اس نے پلٹ کر جواب دیا۔
"میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی
سے بچا لے گا۔" نوحؑ نے کہا "آج اللہ کے حکم
سے کوئی چیز بچانے والی نہیں ہے، سوائے اس
کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے۔" اتنے میں ایک
موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی
ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔ حکم ہوا "اے
زمین! اپنا سارا پانی نگل جا، اور اے آسمان
رک جا۔" چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا۔ فیصلہ
چکا دیا گیا، کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا
"گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم"
نوحؑ نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا "اے رب
میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور تیرا

وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ
الْحٰكِمِيْنَ ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ
مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ
صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ
لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ
تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ
رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ
مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاِلَّا
تَغْفِرْ لِيْ وَتَرْحَمْنِيْٓ اَكُنْ مِّنَ
الْخٰسِرِيْنَ ۝
قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا
وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓي اُمَمٍ
مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ
ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(ھود۔ آیات ۲۵ تا ۴۸)

وعدہ سچا ہے۔ اور تو سب حاکموں سے بڑا اور
بہتر حاکم ہے۔" جواب میں ارشاد ہوا" اے نوحؑ
وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے، وہ تو ایک
بگڑا ہوا کام ہے، لہٰذا تو اس بات کی مجھ سے
درخواست نہ کر جس کی حقیقت تو نہیں جانتا۔ میں تجھے
نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ
بنالے۔" نوحؑ نے فوراً عرض کیا" اے میرے ربّ، میں
تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے
مانگوں جس چیز کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے
معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔"
حکم ہوا" اے نوحؑ! اتر جا ہماری طرف سے
سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور اُن گروہوں پر
جو تیرے ساتھ ہیں، اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں
جن کو ہم کچھ مدت سامانِ زندگی بخشیں گے پھر
انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔"

فصل ۲

قومِ نوحؑ کا زمانہ، مسکن اور اُس کی گمراہی

قومِ نوح کا مسکن

قرآن کے اشارات اور بائیبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائیبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں ہوا ہے۔ اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح ہی بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور آرمینیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسلٍ چلی آرہی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے آس پاس، اور آرمینیہ کی سرحد پر کوہِ اراراط کے نواح میں نوح کے مختلف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے۔ اور شہر نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح علیہ السلام نے ڈالی تھی۔ حضرت نوح کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی، اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم کسی ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انھوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری خول چڑھا دیا۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ — ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا۔ اس نے کہا۔

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِىْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝

(الاعراف۔ آیات ۵۹ تا ۶۴)

"اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ میں تمھارے حق میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔ اس کی قوم کے سرداروں نے جواب دیا "ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو"۔ نوحؑ نے کہا "اے برادرانِ قوم! میں کسی گمراہی میں نہیں پڑا ہوں بلکہ اللہ رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں، تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمھارا خیرخواہ ہوں۔ مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمھیں معلوم نہیں ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعہ سے تمھارے رب کی یاددہانی آئی تاکہ تمھیں خبردار کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر رحم کیا جائے"۔ مگر انھوں نے اس کو جھٹلایا۔ آخرکار ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں نجات دی اور ان لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ یقیناً وہ اندھے لوگ تھے۔

قومِ نوحؑ کی اصل گمراہی

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ اصل

گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی، شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں رونما ہو گئیں۔ جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھیرا لیے گئے تھے، ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا۔ اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ اور تقسیم پیدا کر دی اور اجتماعی زندگی کو ظلم اور فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوحؑ نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی۔ مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔

قومِ نوحؑ کے وہ بت جنھیں بعد میں مشرکینِ عرب پوجنے لگے

قوم نوحؑ کے معبودوں میں سے یہاں ان معبودوں کے نام لیے گئے ہیں جنھیں بعد میں اہل عرب نے بھی پوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازِ اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قوم نوحؑ کے قدیم معبودوں کا ذکر سنا ہو گا اور جب از سرِ نو اُن کی کی اولاد میں جاہلیت پھیلی ہو گی تو انہی معبودوں کے بُت بنا کر انھوں نے پھر انھیں پُوجنا شروع کر دیا ہو گا۔

وَدّ۔ قبیلۂ قُضاعہ کی شاخ بنی کلب بن وُبرہ کا معبود تھا جس کا استھان انھوں نے دُومۃ الجَندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام وَدَم اَبَم (وِدّ باپ) لکھا ہوا ملتا ہے۔ کلبی کا بیان ہے کہ اس کا بت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وُدّ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبدِ وُدّ ملتا ہے۔

سُواع۔ قبیلۂ ہُذَیل کی دیوی تھی اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ یَنبُوع کے قریب رُہاط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

یَغُوث۔ قبیلۂ طَے کی شاخ اَنعُم اور قبیلۂ مَذحِج کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ مذحج والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان جُرَش کے مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبدِ یغوث ملتا ہے۔

یَعُوق۔ یمن کے علاقہ ہَمدان میں قبیلۂ ہَمدان کی ایک شاخ خیوان کا معبود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

نَسر۔ حِمیَر کے علاقے میں قبیلۂ حِمیَر کی شاخ آلِ ذوالکلاع کا معبود تھا اور بَلخع کے مقام پر اس کا بت نصب تھا

(دیکھیے صفحہ ۲۵)

اسلامی انقلاب کی نفیر

جناب محمد نصر اللہ خان خازن

(۲)

یہ جو کچھ ہو رہا ہے ایک منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے اور اُن منصوبوں کا ایک حصہ ہے، جو صدیوں پہلے تیار کئے گئے تھے۔ اب اس منصوبے کو بتدریج دُنیا میں نافذ کیا جا رہا ہے۔ شروع میں استعماریوں نے کسی جگہ ایک سکول کی بنیاد رکھی۔ ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آنکھوں پر غفلت کی پٹی باندھے رکھی۔ اور بھی بہت سے ہماری طرح غفلت کا شکار رہے۔ پھر یہ غفلت بڑھتی رہی اور اب آپ دیکھیے تمام دیہات و قصبات میں ان کے اسکول اور کالج ہیں۔ ان سکولوں اور کالجوں میں اُنھوں نے ہمارے بچوں کو اسلام سے بیگانہ رکھنے کی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ ہماری پسماندگی، ضعف و اضمحلال اور بدبختی کا اصل سبب یہی منصوبہ بند تعلیمی نظام ہے۔ وہ ہماری دولت، ہمارے معدنی ذخائر، زرعی پیداوار اور افرادی قوت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اِدھر ہم ہیں کہ بدبختی کا شکار ساری دُنیا میں غربت و افلاس کے ہاتھوں جُوتیاں چٹخا رہے ہیں۔ کیونکہ شریعت اسلامی نے فقر و فاقہ اور غربت و افلاس کا جو علاج تجویز کیا تھا اُس سے ہم بے خبر ہیں۔ اُدھر ہمارے یہ "مہربان" اور اُن کے یہ چیلے چانٹے ہیں کہ اپنے محلوں اور بنگلوں میں بیٹھے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اغیار کی اس منصوبہ بندی کا مشاہدہ آج ہماری یونیورسٹیوں اور دینی درس گاہوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی اسلامی حکومت کے موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہے تو اُسے اپنے نظریات کے بارے میں تقیہ سے کام لیے بغیر

چارہ نہیں - ورنہ استعمار کے یہی کارندے اسلام پر برس پڑیں گے - حتیٰ کہ جب میری یہ کتاب پہلی بار پریس میں گئی تو شاہ کے گماشتوں نے عراق میں اس کا بدلہ لیا - ان لوگوں سے وہ مایوس کن حرکات سرزد ہوئیں جن کا کسی کو بھی فائدہ نہ تھا - یہی نہیں! ہمیں یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ کچھ لوگ جنگی لباس پہننا بھی اخلاقی مروت اور اجتماعی عدل و انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں - حالانکہ ہمارے ائمہ کرام حضرات علیہم السلام امت کی خاطر جنگی لباس پہنتے، ہتھیار بند رہتے اور ہمہ وقت مصروفِ جہاد رہتے تھے - چنانچہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام جنگی لباس پہن کر گلے میں تلوار حمائل کرتے تھے اور یہی سنت حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی تھی - اور اگر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کو موقع ملتا تو وہ بھی اور ان کے اخلاف بھی ضرور ایسا ہی کرتے - آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جنگی لباس پہننا اخلاقی مروت اور اجتماعی عدل و انصاف کے خلاف ہو - ہم تو اسلامی حکومت کی تشکیل کے داعی ہیں - تو کیا ہم صرف عمامہ اور عبا پہننے ہی کو برحق تسلیم کریں، اس اصول کی بنا پر کہ باقی چیزیں پہننا مروت اور اجتماعی عدل کے خلاف ہے؟

آج ہم جن مصائب سے دوچار ہیں یہ انہی گمراہ کن افکار و نظریات کا ثمرہ ہے - لہٰذا اس وقت ہمیں چاہیے کہ ہم سرتوڑ کوشش کر کے یہ ثابت کریں کہ اسلام نے ہمیں اسلامی حکومت کے قیام کے لیے اصول و مبادی دیے ہیں - یہ ہماری اوّلین ضرورت ہے - کیونکہ دشمن اسلام قوتیں اپنے گماشتوں کے تعاون سے مسلسل عوام میں اس طرح کی لغو اور خلافِ حقیقت باتیں راسخ کر کے ان کے ذہنوں کو مسموم کر رہی ہیں - یہ لوگ اسلام کے سیاسی نظریات اور قانونی نظام کو عملی زندگی سے دور رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے - استعمار کی ان تخریبی سرگرمیوں اور ضعف و اضمحلال کے ان عوامل پر غور و فکر سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے اہل وطن اپنے دشمنوں کی مادی ترقی کے مقابلے میں احساس کہتری میں مبتلا ہو گئے ہیں - جب بعض قوموں کو صنعتی اور سائنسی میدان میں ترقی کرتے دیکھتے ہیں تو ہمارے بعض اہل وطن اس احساس کا شکار ہو جاتے ہیں کہ ہماری اس پسماندگی اور کمزوری کا اصل سبب ہمارا دین ہے، لہٰذا مادی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ہم دین و شریعت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں اور اسلامی عقائد و تعلیمات کو خیرباد کہہ دیں - جب غیر مسلم قومیں چاند پر جانے لگتی ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ہمیں اس سے روک رہا ہے -

میں ان سے کہتا ہوں کہ تسخیر کائنات کے سلسلے میں مشرقی بلاک اور مغربی بلاک کی موجودہ خیرہ کن ترقی اور چاند پر اُن کا پہنچنا اُن کے قوانین کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ کیونکہ تسخیر کائنات کے بارے میں دونوں بلاکوں کے اندر انداز فکر اور لائحہ عمل میں بُعد المشرقین ہے۔ بہر حال یہ لوگ خواہ مریخ پر چلے جائیں یا کہیں اور، شرفِ انسانی میں کسی اضافہ، دُنیا میں اخلاقی فضائل کے فروغ اور انسان کو مادی ترقی کی طرح رُوحانی ترقی سے بہرہ ور کرنے سے ہمیشہ قاصر رہیں گے۔ یہ انسان کے اجتماعی مسائل کے حل سے کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ انسان کی جملہ مشکلات کے حل اور اُس کی نامرادیوں کے اِزالہ کے لیے عقیدہ کی جس صالحیت اور اخلاق کی جس پاکیزگی کی ضرورت ہے اس سے یہ یکسر محروم ہیں۔ خلاء اور کائنات کی تسخیر کے لیے مطلوب مادی وسائل رُوحانی اور اخلاقی ارتقاء میں کسی کام نہیں آسکتے۔ یہ ساری دولت و ثروت، یہ سارے مادی ذرائع و وسائل اگر انسان کی معاشی پریشانیوں کا علاج کرسکتے ہیں اور اُس کی معاشرتی فلاح و بہبود میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں اور اس کی اجتماعی زندگی کو عدل و انصاف پر قائم اور متوازن کرسکتے ہیں تو صرف اس صورت میں جب کہ انسان ایمان کی دولت سے بہرہ ور اور اسلامی عقیدہ و اخلاق سے مزیّن ہو۔ اسلامی عقائد و نظریات اور اسلامی اخلاق و قوانین کے امین صرف ہم ــــ اہل اسلام ــــ ہیں۔ صرف یہ دیکھ کر کوئی چاند پر جا رہا ہے اور کوئی سائنسی ایجاد کر رہا ہے۔ ہمیں اپنے دین و شریعت کو خیرباد نہیں کہہ دینا چاہیے۔ یہ دین اور یہ شریعت حیاتِ انسانی سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ انسان کے حقیقی صلاح و فلاح اور دُنیا و آخرت میں اس کی سعادت کے لیے نسخۂ کیمیا صرف اور صرف اسلام ہی کے پاس ہے۔

استعماری قوتیں ہمارے عوام کے اندر اس طرح کے شکوک و شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں "شریعت اسلامی میں نظامِ حکومت کا کوئی تصور نہیں۔ نہ اس میں نظامِ حکومت کے مختلف ادارات کا کوئی وجود ہے، اور اگر بالفرضِ محال ہے بھی تو وہ قوتِ نافذہ کا محتاج ہے۔ اس میں صرف تشریع ہے اور بس"۔ ظاہر ہے یہ پروپگنڈا بھی ان سازشوں کا ہی ایک حصہ ہے جو مسلمانوں کو سیاست، حکومت اور ملکی معاملات سے دُور رکھنے کے لیے کی جا رہی ہیں۔ یہ بات ہمارے اس نظریے کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس کا ذکر ہم نے آغازِ کلام میں کیا ہے۔ ہم "ولایت" پر یقین رکھتے ہیں۔ اس بات کی ضرورت پر بھی ہمارا اعتماد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد خلیفہ کا تعین کیا ہے اور بالفعل کیا ہے۔

تعیین خلیفہ سے مراد کیا ہے ؟ کیا اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ حیات انسانی کے بارے میں چند احکام بیان کر دیئے جائیں ؟ اس سے مراد محض احکام کا بیان کرنا ہی ہو تو اس صورت میں خلیفہ کی کوئی حاجت نہیں۔ اس کے لیے تو صرف یہی کافی تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں اسلامی احکام کی عام تشہیر کرتے اور اپنے پیچھے ایک لکھی لکھائی کتاب چھوڑ جاتے تاکہ بعد کے لوگ اس سے استفادہ کرتے رہتے

درحقیقت جہاں تک میں سمجھتا ہوں ——— خلیفہ کے تقرر کا اصل مقصد تنفیذ احکام ہے ——— جب تک کسی قانون کی پشت پر اس قانون پر خلوص کے ساتھ ایمان رکھنے والی قوت نافذہ نہ ہو، عوام کے دلوں میں نہ اُس کا احترام و وقار پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کا نفاذ ممکن ہوتا ہے۔ دنیا میں کہیں بھی ایسا نہیں کہ ہے کہ محض قانون بنائے گئے ہوں اور انہیں نافذ و جاری کرنے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی ہو۔ یا اُن کے نافذ کرنے کے لیے کوئی مقتدر ادارہ وجود میں نہ لایا گیا ہو۔ محض قوانین بنانے سے کیا فائدہ ؟ وضع قانون کے ساتھ نفاذِ قانون ایک لازمی چیز ہے۔ جس کے بغیر معاشرہ ضعف و اضمحلال اور فتنہ و فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تنفیذ احکام کے لیے قوتِ نافذہ کا فراہم کرنا نہایت ضروری قرار دیا ہے۔ ولی الامر (صاحبِ امر) ہوتا ہی وہ شخص ہے جس کے پاس قوانین نافذ کرنے کے پورے اختیارات ہوں یہی فریضہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا۔ اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو گویا آپؐ نے فریضہ رسالت ہی انجام نہیں دیا۔ اور یہ عقل و نقل کے خلاف بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کے محض بیان و تبلیغ پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ سوسائٹی میں انہیں حکومت کے زور سے نافذ اور جاری کیا ہے۔ اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم قانون کے محض معلم و مبلغ ہی نہ تھے بلکہ آپؐ اسے صاحبِ اختیار (اقتدار) کی حیثیت سے نافذ کرنے والے بھی تھے۔ آپ مجرموں کو سزائیں دیتے تھے۔ چور کا ہاتھ کاٹتے غیر شادی شدہ زانی یا زانیہ کو کوڑوں کی، اور شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کرنے کی سزا دیتے اور ریاست میں عدل و انصاف قائم کرتے تھے۔ خلیفہ کا بھی یہی فرض ہے اور اس سے ایسی بات کا تقاضا کیا گیا ہے۔

خلیفہ محض واضع قانون یا مبلغ قانون ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ خلیفہ کے ہاتھ میں وہ طاقت اور اختیار ہوتا ہے جس سے وہ ملک میں قانون نافذ کرتا ہے اور اس سے حکومت کے قیام اور اس میں قانون نافذ کرنے والے ادارات کی تشکیل و تنظیم کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے جس سے " ولایت فقیہ " کا عقیدہ جزو ایمان ہے۔ اس مقصد کے لیے جدوجہد کرنا " ولایت " پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔

آپ لوگوں کا فرض ہے کہ اسلام کو آج دنیا میں غالب و نافذ کرنے کا حق ادا کریں۔ عوام کو "ولایت" سے روشناس کرائیں اور اُن پر یہ حقیقت واضح کریں کہ "ولایت" ہمارے عقیدے کا جزو ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے خلیفہ مقرر فرمایا ہے۔ اسی طرح ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام اشد ضروری ہے۔ اسی لیے ہم اللہ کے قانون اور اُس کی شریعت کو دنیا میں نافذ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اسی لیے ہم عوام کے اجتماعی مسائل حل کرنے اور اُن کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی فکر کر رہے ہیں۔ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنا ولایت پر ایمان لانے کا تقاضا اور اُس کا مظہر ہے۔ ضروری ہے کہ آپ آگے بڑھ کر عوام میں اسلامی حکومت، اسلامی دستور اور اسلامی قوانین کی وسیع پیمانے پر بلاکم وکاست تبلیغ و تشہیر کریں۔ اسلامی حکومت کے قیام کا فریضہ بلاخوف لومۃ لائم پوری تندہی اور خود اعتمادی کے ساتھ انجام دیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر عاید کردہ فرض ہے۔ اسی کی توفیق و نصرت کی اُمید پر اُس کی ادائیگی میں اپنا سب کچھ لگا دیں۔

استعماری قوتیں گذشتہ تین صدیوں سے اپنی تیاری میں مصروف ہیں۔ اُنھوں نے صفر سے آغاز کیا تھا اور اب وہ اپنے منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو چکیں ہیں۔ آج ہمیں بھی صفر سے آغاز کرنا ہے۔ اہلِ مغرب اور اُن کے آلہ ہائے کار کو اب مزید مہلت نہ دیں۔ عوام کو اسلام سے روشناس کرائیں تاکہ نوجوان نسل یہ نہ سمجھے کہ علمائے اسلام نجف اور قم کے گوشہ ہائے عزلت میں بیٹھے دین کو سیاست سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور انہیں حیض و نفاس کے مسائل کے سوا اور کسی چیز میں مہارت نہیں ہے۔ سیاست سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں نہ سیاسی اور اجتماعی مسائل میں درک حاصل ہے نہ اُن میں یہ اہلیت ہے وغیرہ وغیرہ۔

استعمار نے ہمارے نصابِ تعلیم میں یہ بات بڑی ہوشیاری کے ساتھ داخل کر دی ہے کہ دین کا حکومت اور مُلکی مسائل سے الگ رہنا آج کے دَور میں انتہائی ضروری ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں دین سیاست سے علیحدہ تھا؟ کیا اُس زمانے میں کچھ ماہرینِ دین تھے اور کچھ ماہرینِ سیاست؟ اور پھر کیا خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اور پھر کیا حضرت علی علیہ السلام کے زمانے میں سیاست دین سے علیحدہ تھی؟ اور کیا اس

مبارک زمانے میں دین کا ڈھانچہ الگ اور سیاست کا الگ تھا؟

غیر ملکی استعمار اور نظامِ باطل کے علم بردار یہ پروپاگنڈا دین کو انسان کی اجتماعی زندگی اور اس کے مسائل سے الگ رکھنے کے لیے کرتے ہیں۔ ضمناً وہ علمائے اسلام کو عوام سے دُور اور عوام کو علما سے الگ تھلگ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ علما مسلمانوں کی آزادی و استقلال کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اگر دین کو سیاست و حکومت سے جُدا رکھنے کی کوشش کامیاب ہوتی ہے تو وہ بآسانی ہماری دولت و ثروت بھی لُوٹتے ہیں اور ہم پر حکومت بھی کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ہمارا مقصدِ زندگی صرف نمازیں پڑھنا، دُعائیں مانگنا اور خدا کا ذکر کرنا ہی ہو اور اس سے زیادہ کچھ نہ ہو تو یقین جانیں استعمار اور استعمار پرستوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں نماز پڑھیں جب چاہیں اذان دیں اور اللہ جتنا ثواب دے لیتے جائیں۔ ثواب کتنا اور کیا ہوگا۔ اس کا حساب اللہ کے ذمہ رہنے دیں۔ اللہ کے سوا طاقت و توفیق کا مالک اور کون ہے؟ موت کے بعد ہمارا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ جب ہماری سوچ ہی یہ ہو تو پھر نہ ہم پر کوئی ذمہ داری ہے۔ نہ ہمیں کسی باز پُرس کا کوئی اندیشہ! کیا دین کا تقاضا صرف یہی ہے اور بس!

ایک دفعہ عراق میں برطانوی استعمار کے ایک افسر نے جب اذان سُنی تو اس سے دریافت کیا کہ برطانوی سیاست کو اس سے کیا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے"؟ اُسے بتایا گیا کہ "اس سے کوئی خطرہ نہیں" اُس نے جواب دیا "اچھا! تو پھر جو کچھ یہ کہہ رہا ہے، اُسے کہنے دو، اور جب تک جی چاہے کہتا رہے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں"۔ یہ ہے اُن کا اندازِ فکر! جب تک آپ استعمار کی سیاست میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں اور علمی دائرے میں رہ کر دینی علوم کے پڑھنے پڑھانے میں لگے رہیں تو آپ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ جتنی چاہیں نمازیں پڑھیں اور جتنا چاہیں اللہ کی یاد کرتے رہیں۔ اُنہیں تو صرف آپ کے تیل دپٹرول سے غرض ہے۔ آپ کی نمازوں سے انہیں کیا کام؟ اُنہیں تو آپ کے معدنی ذخائر درکار ہیں! ہمارے ملک میں انہیں اپنے مال کی منڈی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ملک میں ایسی کٹھ پتلی حکومتیں دیکھتے ہیں جن کی نظر صرف ملک کی صنعتی ترقی پر ہے۔ انہیں دولت سمیٹنے کے لیے صرف کارخانے درکار ہیں اور بس! غیر ملکیوں کی یہ خواہش ہے کہ ہم با اصول و باضمیر انسانوں کے معیار تک نہ پہنچنے پائیں۔ کیونکہ انہیں باضمیر اور با اصول انسانوں

سے خوف آتا ہے۔ جب وہ کسی جگہ کسی باضمیر و بااصول انسان کو دیکھ لیتے ہیں تو اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ شخص سب سے نمایاں اور سب کا منظورِ نظر ہوتا ہے۔ اس کی سیرت و کردار کے اندر اتنی جاذبیت ہوتی ہے کہ پورے معاشرے کو اپنی پرکشش شخصیت سے متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔ اگر ایسے شخص کی قیادت و راہنمائی میں لوگ اٹھ کھڑے ہوں تو وہ عمارت ہی دھڑام سے زمین بوس ہو جائے جس کی تعمیر پر دشمن نے ایک طویل عرصہ صرف کیا ہوتا ہے۔ ظلم و جور اور خیانت و غداری کے پاؤں تلے سے زمین کھسک جاتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی بااصول و باضمیر انسان انہیں نظر آتا ہے، وہ اس کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اور کرائے کے قاتل حاصل کرتے ہیں۔ یا ناکامی کی صورت میں ڈھنڈورہ پیٹنے لگتے ہیں یا پھر جلا وطن کر دیتے ہیں یا پھر اس پر یہ تہمت چسپاں کر دیتے ہیں کہ یہ "سیاسی آدمی ہے۔" "یہ سیاست باز عالم ہے"۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیاسی نہ تھے؟ کیا آپ نے سیاست میں حصہ نہ لیا۔ کیا سیاست میں حصہ لینا کوئی عیب ہے؟

یاد رکھیں یہ سب باتیں دشمنانِ اسلام اور ان کے کارندوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ اُن کے پیشِ نظر سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آپ کو قومی سیاست سے، ملکی مسائل سے اور اجتماعی معاملات میں حصہ لینے سے باز رکھیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ آپ ظالم و خائن اور عوام کا خون چوسنے والے حکمرانوں کو کرسیِ اقتدار سے نہ ہٹائیں۔ بلکہ اُن کی کوشش یہ ہے کہ اُن کی من مانیوں کے لیے فضا ہموار رہے اور وہ جس طرح چاہیں کریں۔ جہاں چاہیں فتنہ اٹھاتے پھریں لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو جب چاہیں لوٹیں اور کوئی انہیں روکنے اور ٹوکنے والا نہ ہو۔

(ختم شد)

(بقیہ تذکرۂ انبیاء)

جس کی شکل گدھے کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیت نسور، اور اس کے پجاریوں کو اہلِ نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے جو آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھے کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

(باقی)

مغربی تہذیب کا بحران

یورپ ——— ایک وسیع پاگل خانہ

جناب ریاض الحسن نوری صاحب

(۳)

جائز سے ناجائز کی زیادہ قدر

عرض کردہ حالات میں ولد الحرام Bastard ہونا بھی امتیازی نشان سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ لیا جاتا تھا کہ اس کی والدہ نے کسی بہت ہی بہادر نائٹ کے لیے عصمت کی قربانی دی تھی۔ اسی وجہ سے فرینکش حکومت کے بانی Clotwig کے ناجائز بیٹے کو باپ کی موت کے بعد جائز بیٹوں کی نسبت سلطنت کا کہیں بڑا حصہ وراثت میں ملا۔ فاتح ولیم William the Conqueror اپنے لقب "ولیم دی باسٹرڈ" کا کسی طور پہ برا نہ مانتا تھا۔ لیکن ہماری تاریخ کی کتب اس بات کو واضح نہیں کرتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہیرو کے لیے "باسٹرڈ" (نتیجۂ گناہ) ہونا تقریباً لازمی امر تھا[1]۔ باسٹرڈ ہونے کا الزام لگاتار شارلمین، چارلس مارٹل اور دوسرے لوگوں پر لگایا جاتا رہا ہے۔ اسی طرح نیم دیومالائی ہستیوں مثلاً شاہ آرتھر Concho Bar Ronland Gowain اور Cuchulainn پر بھی یہ لفظ چسپاں کیا جاتا رہا ہے۔ نتیجۂ گناہ Bastardy ہونے پر فخر جدید دور میں بھی بالکل ناپید نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کوئی بیس سال ہوئے انگلینڈ کا ایک وزیر اعظم بھی اپنے ولد الحرام ہونے پر فخر کیا کرتا تھا[2]۔ (نوٹ از ایڈیٹر: امریکی جمہوریہ کے دستور سازوں اور اس کے صدروں

[1] لیونارڈی ڈاونسی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس سے ذہین شخص یورپ میں آج تک نہیں پیدا ہوا۔ اس کے متعلق تو یہ ثابت شدہ امر ہے کہ وہ ولد الحرام تھا۔

[2] صفحات ۲۲ تا ۲۹ از سیکس ان ہسٹری مصنف G. Rattary Taylor

اور دیگر عہدہ داروں میں خاصی شہرت دار شخصیتیں ناجائز ولادت کے شرف سے مشرف تھیں (اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ یورپ نے عام تاریخ کو تبدیل کر کے پیش کیا ہے۔ مثلاً نائٹ لوگ جو پرلے درجے کے بدکار، بداخلاق اور بہت ہی ناہنجار لوگ تھے۔ اُن کو تاریخ وادب میں ہیروز کی مانند پیش کیا گیا ہے۔

اب ہم نائٹوں کی حقیقت دکھانے کے لیے ایک اور مصنف کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ رچرڈ لیونشن Richard Lewinshon جو ڈاکٹر بھی ہیں اور مؤرخ بھی، انہوں نے اپنی کتاب کا عنوان باندھا ہے۔ "نیکو کارانہ بدکاری" اور اسی عنوان کو دوسرے لفظوں میں یوں لکھا ہے "بہادر سرداروں کے اخلاقیات" (Knightly Morals : virtuous Adultery) اس کتاب کا اقتباس:-

...... قرونِ وسطیٰ میں جنسی بدکاری کو سوسائٹی ادوارِ سابق سے بھی زیادہ کھلے دل سے قبول کرتی تھی۔ سوائے پادریوں، راہبوں اور ننوں کے، کسی کے لیے بھی جنسی جذبات پر کنٹرول ضروری نہ تھا ...... بے وفائی کوئی بُری بات نہ تھی، جب کہ ایک شخص محض ظاہری بھرم قائم رکھے اور ضرورت کے وقت تلوار چلا سکے۔ (اگرچہ اکثر ایسا نہ ہوتا) اور اپنے دل کے جذبات کی خاطر مرنے کے لیے تیار رہو ...... جو نائٹ دوسروں کی بیویوں کو شکارِ بدنگاہی بنانے میں مشاق ہونے سے پہلے تک محض اپنی بیوی تک انحصار کرتا اُسے کسی قابل نہ سمجھا جاتا..... حکومت اور چرچ دونوں ہی نوجوان نائٹ اور بیرن کی لیڈی کے ناجائز تعلقات کو برداشت کرتے تھے۔

ایک جنگجو نوجوان اپنے دل کے معاملے میں مذہب کو بھی شامل کر سکتا تھا..... اس کے لیے عام طریقہ یہ تھا جو کہ بظاہر ناقابلِ یقین نظر آتا ہے کہ کنواری مریم (نعوذ باللہ) کی اشیرباد اس تعلق کے لیے لی جاتی تاکہ سائل کے لیے لیڈی کے دل میں جگہ پیدا ہو جائے.....

یعنی انسان نے کبھی ایسی شرمناک بات نہ کی تھی کہ مقدس کنواری کو منظم بدکاری کا سرپرست قرار دے دے۔

ان وجوہات کی بنا پر ممکن تھا کہ آئندہ نسلیں اِن نائٹوں کے کردار پر زیادہ سخت تنقید کرتیں — مگر

گویّے عوامی شاعروں (Bards) نے اُن کی شان میں عشقیہ گاتے اور نظمیں گا گا کر اُن کی عظمت کا نقش جما دیا...... ان میں سب سے پہلا شاعر ڈیوک ولیم نہم تھا۔ وہ ایک دل پھینک تھا۔ اور طوان وان کے فلسفہ کا پیش رو تھا...... اُس کا ایمان تھا کہ ایک حقیقی مرد کو چاہیے کہ وہ تمام عورتوں کو حاصل کرے[۱]۔ اور اُس کا عمل بھی اسی پر تھا۔ جب بڑی ردوقدح کے بعد وہ صلیبی جنگ پہ جانے کے لیے تیار ہوا تو اُس نے ارضِ مقدس کے سفر کے دوران اپنے گرد عورتوں کے جھنڈ (Swarm) (یا ریوڑ؟ اضافہ ایڈیٹر) جمع کیے رکھے۔ مؤرخ Geoffroy کے بیان کے مطابق اس حملہ کی شکست کی وجہ بھی اس کی عیاشی تھی اس کی شاعری کے کچھ حصے باقی رہ گئے ہیں۔ بعض میں فلسفہ ہے اور باقی محض بھونڈی فحش گوئی ہے.... یہ نائٹ حضرات افلاطونی محبت پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اپنے دلوں کی "لیڈی" کو مکمل طور پر فتح کرنے کی تگ و دو میں رہتے تھے۔ کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ اُن میں سے کسی ناکام محبت نے رہبانیت اختیار کرلی ہو......[۲]

یورپ کے بام مارگی اطوار

عام قسم کے نائٹوں کے علاوہ تاریخ یورپ میں ایسے نائٹوں کے نظام بھی ملتے ہیں جو منافقانہ طور پر عیسائی بنے ہوئے تھے۔ اور کفر و جاہلیت اور حماقت کا مرقع تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں صحیح عیسائیت نہ پہنچ سکی اور نہ پنپی۔ یورپ کے قدیم جاہلانہ مذہب جس میں اعضائے تناسل کی پوجا بنیادی حیثیت رکھتی تھی۔ اسی کے ساتھ عیسائیت گڈمڈ ہوگئی۔ اس سلسلے میں بہت سی کتب یورپ میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مگر حکومتیں ان کو خلاف قانون قرار دیتی رہی ہیں تاکہ مغربی تہذیب کا بھرم قائم رہے۔ مگر اب آزاد خیالی کا دور ہے اس لیے حال ہی میں دو اہم کتب چھپی ہیں۔ جن کے

---

[۱] کنزے نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ عورتوں کی فطرت کے خلاف مرد دنیا کی ہر عورت سے تعلقات قائم کرنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ مشرق نے تو مذہب نے مردانہ جذبات کا انضباط کیا ہے۔ مگر مغرب کی آزاد منشی سانڈوں اور بکروں کے معیار کی ہے۔ اسلام نے معاشرے کو گندگی سے بچانے کے لیے ہی عورتوں کے لیے قانونِ حجاب مقرر کیا ہے۔

[۲] P.P. 127-130 A History of Sexnal customs (A Premier Book)
By Richard Lauhin Satron M.D.

نام درج ذیل ہیں:-

1. A Discourse on the worship of Priapus by Richard Payne Knight.
2. The worship of Generative Powers during the middle ages of Western Europe by Thomas Wright.

مذکورہ بالا دونوں کتب دورِ جدید کی مشہور امریکی خاتون Ashley Montagu نے جو انسانیات Anthropology کی ماہر ہیں، ایک جلد میں مرتب کر دی ہیں۔ اسی موصوفہ نے اس جلد کا ابتدائیہ لکھا ہے۔ ابتدائیہ میں مصنفین کی تعریف کرتے ہوئے وہ مصنف Payne Knight کے متعلق لکھتی ہیں کہ وہ کسی نظریہ کو لے کر نہیں چلتا بلکہ وہ نتیجہ سے بے پرواہ ہو کر حقیقتوں کی پیروی کرتا ہے۔ اُس نے اپنے جمع کردہ مجسموں کی جو تصاویر دی ہیں وہ اس کے اخذ کردہ نتائج کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں..... مجسمے اور چھوٹے چھوٹے ماڈل اعضائے تناسل کے ہیں جو بطور تعویذ استعمال ہوتے تھے اور ایک زمانے میں تمام یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ یورپ کے بعض حصوں میں آج بھی یہ مجسمے اور تراشیدہ ماڈل موجود ہیں۔ دوسری کتاب کے متعلق وہ لکھتی ہیں کہ اس میں مردانہ اور زنانہ دونوں قسم کے اعضاءِ تناسل کی پوجا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر ۱۹۳۱ء تک جتنی کتب چھپی ہیں۔ ان کی جدول کتابیات Bibliography of Sexual rites and Custums کے نام سے ۱۹۳۱ء میں لندن سے شائع ہوئی تھی۔ مذکورہ بالا مجسمے اور تعویذ وغیرہ لندن میوزیم میں موجود ہیں۔

اب تک کے بیانات اور جو کچھ آئندہ ہم پیش کر رہے ہیں، اُن سے ناظرین پر دو اہم باتیں واضح ہو جائیں گی۔ اوّل یہ کہ یورپ ہمیشہ جاہلیت اور حماقتوں کا منبع رہا ہے۔ دیگر یہ کہ یورپ میں جب مشرق سے علم اور آزادی آئی تو پادریوں اور حکومت کی حماقت اور بدکاریوں کی وجہ سے مغرب میں مذہب بھی مسخ اور بدنام ہو کر رہ گیا۔ اور اسی وجہ سے یورپ میں مذہب دشمن تحریکیں فروغ پا سکیں۔

قصہ مختصر Thomas Wright اپنی مذکورہ کتاب جو مجموعے کے دوسرے حصے کے طور پر چھپی ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۷ پر لکھتا ہے کہ:-

عیسائیت سے پہلے یورپ میں اعضائے تناسل کی پوجا عام تھی اور خاص بات یہ کہ انسانی فطرت میں یہ اس طرح ثبت تھی کہ انجیل کی نشر و اشاعت بھی اس کو ختم نہ کر سکی

کیونکہ یہ اس کے بعد بھی جاری رہی اور تسلیم کی جاتی رہی اور اکثر قرونِ وسطیٰ کے پادری اس کی ہمت افزائی کرتے رہے۔

...... پیم نائٹ کی کتاب سے واضح ہوا کہ یہ رسم اس کے دور میں Isernia (اٹلی) کی ... میں جاری ... کتاب کے شائع ہونے کے ... سال بعد ۲۶ رجولائی ۱۸۰۵ء کو ایک خوفناک زلزلہ آیا جس سے یہ ... تباہ و برباد ہوگئی ...... اس قسم کی پوجا قدیم روم میں رائج تھی اور ... لشکر اپنے مفتوحہ ... میں پھیلایا ...... گال میں رومن تہذیب کے کھنڈرات سے ... کے مجسمے اور نشان جو اس کے لیے وقف تھے، ملتے ہیں۔ باغات اور کھیتوں کو اس کی حفاظت میں دیا گیا تھا اور Phallus یعنی مردانہ عضوِ تناسل جس کو مختلف شکلوں میں بنایا گیا تھا، اُسے مختلف قسم کے اثراتِ بد سے پناہ لینے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ طلبِ پناہ (یعنی تعوذ) کے نظریے سے فیلس کی شکلیں پبلک بلڈنگوں پر بنائی جاتی تھیں اور گھروں کے اندر بھی اس کے مجسمے اہم جگہوں پر رکھے جاتے تھے۔ چھوٹے مجسموں کو عورتیں زیورات کے طور پر استعمال کرتی تھیں اور بچوں کے گلوں میں بطور تعویذ ڈالے جاتے تھے ...... جنوبی فرانس میں بھی اس کی پوجا زور شور سے کی جاتی تھی جہاں یہ مجسمے ایمفی تھیٹر کی دیواروں اور دیگر بلڈنگوں پر نصب کیے جاتے تھے ...... ان میں سے بعض خاص مجسموں کی تصاویر پلیٹ نمبر ۲، ۳ میں دی گئی ہے۔ ان میں سے پہلی شکل ڈبل فیلس کی ہے[1] داخل ہونے والے دروازوں اور دریچوں وغیرہ پر نصب ہوتے تھے۔ ڈبل اور ٹرپل فیلس کے کانسی کے چھوٹے مجسمے کثرت سے مستعمل تھے جو بطور تعویذ استعمال کیے جاتے تھے ...... (اس کے بعد ملٹیپل فیلس کے مجسموں کی تصاویر اور تفصیل ہے جن کو حذف کیا جاتا ہے) ...... پومپی آئی میں بھی یہ مجسمے ملتے ہیں ...... جب ہم انگلینڈ میں آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی یہ رسم اسی طرح قائم تھی اور کانسی کے فیلس کے مجسمے اسی طرح ملتے ہیں جس طرح کہ فرانس اور اٹلی میں

---

[1] تصاویر دینا اور خصوصاً ایسی لغو تصاویر ہماری شائستگی کے خلاف ہے۔ ناظرین اصل کتاب کی طرف رجوع کریں۔

تھے[1] ...... یہ رسم سویڈن اور جرمن اقوام میں بھی اسی طرح رائج تھی[2]......

" پس ہمیں واضح ثبوت حاصل ہو جاتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے عیسائی سادہ صاف شکل میں فیلس کی پرستش کرتے تھے اور عیسائی دعاؤں اور درخواستوں میں اسی سے خطاب کیا جاتا تھا[3]۔

سینٹ آگسٹائن اپنی طرف سے صفائی دیتے ہوئے ہمیں یہ اصل حقائق بتاتا ہے کہ Liberaila کے رومن تہوار میں ایک شاندار رتھ میں ایک بڑے فیلس کا مجسمہ شہر کے پبلک مقام کے وسط میں دھوم دھام سے لایا جاتا تھا اور ایک باعزت میٹرن اس فحش مجسمے کو پھولوں کا ہار پہناتی تھی۔ ایسا اس دیوتا کو خوش کرنے اور اچھی فصل حاصل کرنے اور ملک سے جادو کے بُرے اثرات دُور کرنے کے لیے کیا جاتا تھا...... ۱۲۶۸ء میں جب سکاٹ لینڈ میں مویشیوں میں دنبالہ پھیلی تو بعض پادریوں نے کسانوں کو اسی مجسمے کی رسوم ادا کرنے کے لیے...... جن بلڈنگوں کو خاص طور پر اس مجسمے کی پناہ میں دیا جاتا تھا وہ چرچ تھے[4]...... ایسے مجسمے عام طور پر صدر دروازے پر نصب کیے جاتے تھے۔ Toulouse کے کیتھیڈرل چرچ پر یہ مجسمہ نصب تھا اور Bourdeaux کے ایک سے زیادہ چرچوں پر اور فرانس کے دیگر اور گرجاؤں پر بھی اس کا مجسمہ نصب تھا۔ مگر انقلاب فرانس کے موقع پر پادریوں کی بدی کے ان نشانات کو برباد کر دیا گیا[5]..

...... خاص بات یہ ہے کہ آئرلینڈ میں زنانہ عضو چرچوں کی حفاظت کے لیے استعمال ہوتا تھا اور جس طرح ان شکلوں کو بنایا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی بڑی اہمیت تھی[6]

قدیم قدرت نے Priapus کو دیوتا بنایا تھا اور قرون وسطیٰ میں اُسے سینٹ کا مقام دے دیا گیا اور بھی مختلف ناموں کے ذریعے اس کی پوجا ہوتی۔ فرانس کے جنوب میں اُسے St. Fountin کے نام

1 P. 19 The Worship of the Generative powers during middle ages of Western Europe by Thomas Wright.

2 P. 26 Ibid. 3 P. 28 Ibid. 4. P. 30, 31 Ibid.

5. P. 32 Ibid. 6 - P. 35 Ibid.

سے پوجا جاتا تھا[1] ...... شمالی ایلپس میں Embrun کے مقام پر سینٹ فاؤنٹن کا فیلس مختلف شکل میں پوجا جاتا تھا۔ عورتیں اس کے سر پہ شراب ڈالتی تھیں۔ اسے پھر ایک برتن میں اکٹھا کیا جاتا تھا.... جب ۱۵۸۵ء میں پروٹسٹنٹوں نے ایمبرن پر قبضہ کیا تو انہیں یہ فیلس بڑے گرجا کے نوادرات میں بحفاظت رکھا ہوا ملا ...... اس سے بھی بڑا لکڑی کا فیلس جس پہ چمڑا چڑھایا گیا تھا وہ Orange کے مقام پر St. Eutropius کے چرچ میں پرستش کے لیے استعمال ہوتا تھا مگر ۱۵۶۲ء میں پروٹسٹنٹوں نے اس پہ قبضہ کر کے اسے پبلک میں آگ لگا دی...... اسی کے مثل Phallic Saints (فیلک سینٹس) کی پوجا St. Guelichor کے نام سے Bourges میں اور St. Griles کے نام سے Britany میں اور سینٹ Regnaud کے نام سے برگنڈی میں ہوتی تھی...... وغیرہ وغیرہ۔

...... بعض جگہ شادی کی رسوم میں دلہن اپنا کنوارپن Priapus کو پیش کرتی تھی[2] ...... اس رسم سے ایک برائی پیدا ہوئی جو NUNNERIES یعنی راہبہ خانوں میں پھیل گئی اور عورتیں لکڑی کا فیلس استعمال کرنے لگیں جس کی اصل مذہبی رسم تھی[3]

1- P. 49, 50.

2- P. 5. (تفصیلات اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں)

3- P. 56, 57 Bio

رسائل و مسائل

سمتِ قبلہ کی شرعی یا حسابی تحقیق و تعیین

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال:- میں ایک مسئلے میں آپ سے رہنمائی اور ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہوں جس نے میرے ملک گی آنا (GUYANA) میں بڑا خلفشار پیدا کر دیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بعض جدید آلات کی مدد سے اس بات کا ادعا و انکشاف کیا گیا ہے کہ ہماری مسجدوں کے محراب خانہ کعبہ سے ۳۸ یا ۴۰ درجے ہٹ کر ہیں۔ بہت سے مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہے کہ ان مسجدوں کو منہدم کر کے یا ترمیم کر کے اُن میں قبلے کا رُخ ٹھیک بیت اللہ کی طرف کیا جائے تاکہ نمازوں کی ادائیگی صحیح ہو۔ بعض دوسرے حضرات کے نزدیک ایسا کرنا ضروری نہیں ہے۔ وہ درمختار کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں جس کی رُو سے ۴۵ درجے یا زاویے سے کم کی حد تک اگر محراب کا رُخ ہٹا ہوا ہو تب بھی مسجدوں کا رُخ صحیح اور اُن میں نماز جائز ہے۔ لیکن گروہِ اوّل کا کہنا یہ ہے کہ یہ کتاب بہت پہلے زمانے میں لکھی گئی جب کہ قبلے کی سمت کا تعین اس طرح ممکن نہیں تھا، جیسا کہ آج ٹیکنالوجی کے بل پر ممکن ہے۔ اس لیے ہمیں ٹھیک ٹھیک سمت قبلہ مقرر کرنی چاہیے۔

براہ کرم واضح کریں کہ درمختار کے فتوے پر اس زمانے میں بھی عمل ہو سکتا ہے یا نہیں اور قبلے کے رُخ میں اگر کسی حد تک کمی بیشی ہو جائے تو نماز صحیح ہو گی یا نہیں؟ اور ہو گی تو اس فرق کے لیے کوئی حد متعین ہو سکتی ہے یا نہیں۔

جواب:- آپ کے سوال کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت نے ہمیں اس بات کا مکلف

نہیں کیا کہ ہم سائنسی علوم اور اُن کے ایجاد کردہ آلات پر انحصار کو دینی اعمال کی تعمیل کے لیے شرط لازم قرار دے دیں۔ یہ شرط ہر حالت میں پوری بھی نہیں ہو سکتی اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے آج کل بھی تردد اور مشقت کا باعث بن سکتی ہے۔

قرآن کریم میں استقبال قبلہ کے لیے "شطر المسجد الحرام" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جس سے مراد یہ نہیں ہے کہ بالکل ناک کی سیدھ میں قبلے کا رُخ متعین کر کے دنیا کے ہر حصے میں نماز پڑھی جائے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ فی الجملہ نمازی اس طرف منہ کر لے جس طرف بیت اللہ ہے۔ سنن ترمذی کتاب الصلوٰۃ باب "ما جاء ان بین المشرق والمغرب قبلۃ" کے تحت حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے۔

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین المشرق والمغرب قبلۃ"

یعنی ہمارا قبلہ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔

یہ ارشاد اہلِ مدینہ کو سامنے رکھ کر فرمایا گیا۔ اہل مدینہ جنوب کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، کیونکہ وہ مکہ شریف سے شمال کی جانب ہیں۔ اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ اہل مدینہ کا رُخ مشرق اور مغرب کے مابین ہونا چاہیے تو وہ قبلہ رُخ سمجھے جائیں گے۔ یہ حدیث دوسرے صحابہؓ سے بھی مروی ہے۔ اس سے فقہاء نے جن میں فقہائے حنفیہ بھی شامل ہیں یہ استنباط کیا ہے کہ استقبال قبلہ میں تھوڑا بہت تفاوت مضر نہیں ہے۔ خود مدینہ منورہ کے بارے میں جب آلات کی مدد سے تفتیش کی گئی ہے تو مسجد نبوی کا رُخ بھی عین بیت اللہ کی سیدھ میں نہیں ہے۔

اس اصول کو علماء نے یوں بھی بیان فرمایا ہے کہ جس شخص کو بیت اللہ سامنے نظر آ رہا ہو اُس پر تو لازم ہے کہ وہ ٹھیک بیت اللہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھے۔ لیکن بیت اللہ جس کے سامنے نہیں ہے۔ اس سے اگر تھوڑا بہت انحراف بھی ہو جائے تو اُس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ فقہائے حنفیہ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جس دیار میں مسلمانوں نے قدیم زمانے میں ایک خاص رُخ پر مسجدیں بنا دی ہوں اور بعد میں یہ منکشف ہو کہ اُن کی سمت میں تھوڑا بہت تفاوت ہے تو اُن مسجدوں کی اکھیڑ پچھاڑ اور سمت قبلہ کی تصحیح کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ کوئی مسجد بنائی جائے تو اس میں زیادہ تحقیق و تدقیق عمل میں لائی جا سکتی ہے اگرچہ وہ بھی لازم نہیں ہے۔

البحر الرائق میں فتاوٰی خیریہ کے حوالے سے امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول منقول ہے " وعن ابوحنیفة المشرق قبلة اهل المغرب والمغرب قبلة اهل المشرق والجنوب قبلة اهل الشمال والشمال قبلة اهل الجنوب وعليه فالانحراف القليل لا يضر "

(امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ اہل مغرب کا قبلہ مشرق ہے اور مشرق والوں کا قبلہ مغرب ہے شمال والوں کا قبلہ جنوب ہے اور جنوب والوں کا قبلہ شمال ہے۔ پس تھوڑے سے بہت اختلاف میں کوئی مضائقہ نہیں)

قلیل وکثیر انحراف کی مزید تعیین وتشریح بھی فقہاء نے اس طرح فرمائی ہے کہ ۴۵ درجے تک انحراف ہو تو قلیل ہوگا اور اس سے زائد ہو تو کثیر شمار ہوگا۔

اس سلسلے میں درمختار کی جو عبارت نقل کی گئی ہے وہ ٹھیک اور منشائے شریعت کے مطابق ہے اور موجودہ حالات پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں جب درجات کی پیمائش کے بعد یہ فتویٰ دیا گیا ہے تو درجات میں تو کوئی کمی بیشی جغرافیہ یا جیومیٹری کے حساب کی رُو سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے حق میں کتاب وسنت سے بھی دلائل موجود ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ فتاوٰی خیریہ میں یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے۔

" ومن القواعد الفلكية اذا كان الانحراف عن مقتضى الادلة اكثر من خمس واربعين درجة يمنة اويسرة يكون ذلك الانحراف خارجا عن جهة الربع الذى فيه مكة المشرفة "

یعنی ۴۵ درجے سے زائد کا انحراف سمتِ قبلہ کو تبدیل کر دے گا کیونکہ رُخ اس چوتھائی حصۂ زمین سے ہٹ جائے گا جس میں مکہ معظمہ ہے اور ایسا تفاوت مفسد صلوٰۃ ہوگا۔ اس سے کم تر انحراف میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آپ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ آپ کے ہاں کی مساجد میں تفاوت وانحراف ۳۸ یا ۴۰ درجے سے زائد نہیں ہے، اس لیے اتنے فرق کے باوجود ان مساجد کی سمتِ قبلہ کو صحیح سمجھا جائے گا اور ان کے اندر کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ہندو پاکستان میں بھی ایک زمانے میں ایک صاحب نے جو ریاضی

(باقی بر صفحہ ۳۸)

مطبوعات

کتاب: پروفیسر عبدالحمید صدیقی
اپنی تحریروں کے آئینہ میں
ناشر: قاضی پبلیکیشنز - ۱۲۱ - ذوالقرنین چیمبرز
گنپت روڈ - لاہور
قیمت: درج نہیں۔

یہ کتاب جب میرے سامنے آئی تو قرآن کے مدرسۂ حکمت کے متعلموں کی یہ مسلمہ حقیقت ذہن میں تازہ ہوگئی کہ

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

سچ ہے جن رفتگان ماضیٔ بعید و ماضی قریب کے خیالات اور جذبات اور خدمات ہمارے ساتھ ساتھ ہیں، ہمارے اندر جذب ہیں، جن کی محبتیں ہمارے سینوں میں موجزن ہیں، جن پر ہم فخر کرتے ہیں، جن کے لیے دعائیں مانگتے ہیں، وہ ہمارے قافلۂ زندگی کے ہم رکاب چل رہے ہیں۔ ان کے جسم جو ان کی ہستی کے چھلکے تھے: اتر کر قبروں میں مدفون ہوگئے، مگر ان کی محبتیں، ان کے عقیدے، ان کی تعلیمات، ان کی خدمات، ان کا حسن گفتار و کردار، اور ان کی تحریریں اور تقریریں ہمارے اندر رچی بسی ہیں، ہمارے ساتھ ساتھ ہیں، انہیں کوئی موت جدا نہیں کرسکتی۔

کتاب پڑھتا رہا اور برادر گرامی عبدالحمید صدیقی کو نہ جانے کہاں اور کیسے دیکھتا رہا کہ "وہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، وہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں"۔ ابھی حورِ صبح کی ساحرانہ آنکھیں نیم وا ہیں اور نگارِ نور بسترِ افق پر اپنی قیامت آفریں انگڑائی لے نہیں چکا ہے کہ عبدالحمید صدیقی بچوں کو سوتا چھوڑ کر "محاذ" کی طرف روانہ ہوگئے۔ گوجرانوالہ اسٹیشن پہنچے، پھر گاڑی سے لاہور، لاہور اسٹیشن سے پبلک لائبریری، اور پبلک لائبریری میں انہوں نے اپنی بزم لوح و قلم آراستہ کرلی ہے۔ کتابوں کی کاغذی نقابیں اوڑھے قدیم اور جدید دور کے علماء اور اتقیا اور مشرق و مغرب کے مفکرین اور ادیب اور عربی و عجمی مفسرین و محدثین آپ کے ہمکلام ہوگئے۔ بیچ میں لاہور کا کوئی محب ـــــ کوئی سعیِ اقامتِ دین کا ساتھی، کوئی ضرورت مند طالبِ علم کوئی پبلشر، کوئی شاگرد ـــــ آگیا تو صدیقی صاحب چند منٹ کے لیے اپنی محفلِ خاص سے نکل کر بزمِ عام میں آگئے۔ ملاقاتی چلا گیا تو پھر وہی مشروبِ ایمان و علم کا دور۔

دن ختم ہو گا۔ یہ درویش منش، مسلم دانش ور لائبریری سے نکلے گا، اسٹیشن پہنچے گا، پھر ریل گاڑی پر گوجرانوالہ پہنچے گا ــــ وہاں سے اپنے گاؤں ــــ وقت پھر ایسا ہو گا کہ بچے سو چکے ہوں گے۔

اتنی جسمانی مشقت اور صرفِ وقت اور کاوشِ دماغ سے مطلوب اگر دولتِ دنیا ہوتی تو ایمان و علم کا یہ سپاہی با آسانی کوٹھی کار کا اور سامانِ آسائش کا مالک ہو سکتا تھا مگر اُس نے تو یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ ملک میں اور دنیا میں سچائی اور نیکی کا وہ راج قائم ہو جس کا نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں ایسے مقالات اور تاثراتی مضامین جمع ہیں جس کے مطالعہ سے آپ عبدالحمید صدیقی کی شخصیت اور اُن کی خدمات کا اندازہ کر سکیں گے۔ اس کے مرتب جناب پروفیسر محمد اکرام صدیقی صاحب (مرحوم کے بھائی) مبارک باد کے مستحق ہیں۔

کاغذ، کتابت، طباعت، سرورق، ہر لحاظ سے اچھا معیار۔

حق تو یہ تھا کہ نہ صرف اس کتاب کا تعارف اپریل ۱۹۸۰ء کے ترجمان القرآن میں آتا بلکہ اس پیارے انسان اور مخلص دوست کی یاد تازہ کرنے کے لیے قلم و قرطاس کی طرف سے مزید خراجِ پیش کیا جاتا۔ کیونکہ اپریل ۷۸ء میں مرحوم کی جسدی زندگی ختم ہوئی۔ مگر میرے، اور رسالے کے حالات کی پیچیدگیاں اس میں مانع رہیں۔ دعا ہے کہ خدا ہمارے اس درویش دانشور بھائی کی خدمات کو قبول کرے۔ اور اُن کی رُوح کو سایۂ رحمت میں شاد رکھے۔ آمین۔

مسئلہ کشمیر اور اس کا حل

مولف: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتبہ: شعبہ تجزیہ و تصنیف اسلامی جمعیت طلبہ

قیمت: چھ روپے پچاس پیسے

پتہ: ا۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور

موجودہ مہذب دنیا کا دعوائے تہذیب اُس وقت تک بے وزن ہے جب تک کرۂ ارضی پر کسی بھی ملک یا علاقے کو کوئی قوت جبر کے شکنجے میں کسے ہوئے ہے اور دنیا کی بڑی اور چھوٹی قوتیں مل کر بھی کسی انسانی آبادی کو حقِ خود ارادیت نہیں دلا سکتیں۔ اس دَورِ منافقت کا یہ المیہ ہے کہ تہذیب ترقی، خوش حالی، امن، خود ارادیت، انصاف اور امداد جیسے صدہا خوبصورت الفاظ تقریروں، بیانوں اور قراردادوں میں روز بولے جاتے ہیں، مگر معنی کے لحاظ سے یہ بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں۔ انسانیت کے رنجیدہ مسائل میں جہاں فلسطین اور سارڈینیا اور فلپائن فہرست میں آتے ہیں وہاں ہمارا قریب ترین مسئلہ، مسئلہ کشمیر ہے۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی قراردادوں میں اعلان

کر چکی ہے کہ بھارت کا ریاست جموں و کشمیر پر قبضہ اس وقت تک ناقابلِ تسلیم ہے جب تک کہ علاقے کے باشندوں سے استصواب رائے نہ کرا لیا جائے، مگر اس قرارداد کے الفاظ مدتوں سے معنی کو ترس رہے ہیں۔ بڑی اقوام کو ذرا خیال نہیں آتا کہ اس صورتِ حالات کی ذمہ داری اُن پر آتی ہے اور اُن کو سے پورا کرنا چاہیے۔

پیشِ نظر چھوٹی سی کتاب میں اسلامی جمعیت طلبہ کے شعبۂ تجزیہ و تصنیف نے مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ان تمام تحریروں، تقریروں اور بیانوں کو جمع کر دیا ہے جو مغفور کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے متعلق صادر ہوئیں۔ اس مجموعے کی مدد سے مسئلہ کشمیر کی تاریخ اور اس کی بین الاقوامی اور آئینی حیثیت اور بھارت کی دھاندلی کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ نیز قاری کے سامنے ایسے خطوطِ فکر آ جاتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کے حل کی تدابیر سوچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

البقیہ رسائل و مسائل:

کے بہت بڑے ماہر تھے امورِ خارجہ کے حسابات لگا کر یہ فرمایا تھا کہ ہند و پاکستان کی کسی مسجد کا محراب یا قبلے کا رُخ صحیح نہیں اور ان میں نماز جائز نہیں۔ ان کے اس استدلال کو اس دیار کے تمام علماء نے بالاتفاق غلط قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ مساجد جوں کی توں موجود ہیں۔ اس طرح کے بودے اور کمزور دلائل کی بنا پر بنی بنائی مساجد اور اللہ کے گھروں کا انہدام سخت ناپسندیدہ ہے۔ دنیا میں بے شمار مساجد ایسی ہوں گی جو صحابہؓ نے، تابعین نے، تبع تابعین نے اور اولیائے کرام نے تعمیر کرائی ہوں گی۔ کیا ہم ان سب کو گرانا شروع کر دیں گے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حطیم کا حصہ پہلے بیت اللہ میں شامل تھا اور بیت اللہ کی تعمیرِ نو میں کسی وجہ سے یہ حصہ شامل ہونے سے رہ گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو بیت اللہ میں شامل نہیں کیا بلکہ بیت اللہ جس طرح تھا اُسی طرح رہنے دیا۔ مساجد کو گرانا بہت بڑی سنگین جسارت ہے۔ گویا جن اسلاف نے مسجدیں بنائی ہیں اور جو لوگ ان میں نمازیں پڑھتے رہے ہیں، اُن سب نے جرم کیا ہے اور اب اس کی تلافی کا دعویٰ بزعمِ خویش کیا جا رہا ہے۔

(بقیہ اشارات) ایسے طوفان میں پھنس جائے تو اُس کی کشتی چکرا کے رہتی ہے۔ وہ گویا رجعت پسندی کا چھوٹا سا جزیرہ ہوتی ہے۔ جس سے چاروں طرف کی لہریں آآ کے ٹکراتی ہیں۔ غلط روش رکھنے والی اکثریت اس پر یہ احساس مسلط کرتی ہے کہ تم گنہگار ہو۔ دوبئی ازم کی لائی ہوئی دوسری مصیبت یہ ہے کہ خاندان کے نوعمر اور ”بوڑھے لونڈے“ کئی کئی کیمرے لیے پھرتے ہیں اور دولہا دلہن کے علاوہ اپنی ماؤں بہنوں سے لے کر ہر وارد شدہ خاتون کے چہرے کا شکار کرتے پھرتے ہیں۔[1]

دولت پرست معاشرے میں شادی بیاہ کے سلسلے میں ایک ایسا رویہ پیدا ہوگیا ہے جو نسائیت کے لیے توہین آمیز ہے پیسے والے لوگ جب رشتے کی تلاش میں نکلتے ہیں تو مالی مفاد پر بھرپور توجہ دیتے ہیں اور پھر شکل وصورت پر، اس کے بعد تعلیم وغیرہ پر۔ خصوصاً لڑکیوں کا حال تو یہ ہوگیا ہے کہ گویا ایک منڈی لگی ہو، اس میں کنیزیں صف باندھے کھڑی ہوں اور پیسے والے لوگ آکر ایک ایک کو دیکھیں اور کسی کو مالی وجوہ سے اور کسی کو شکل وصورت کے باعث مسترد کرتے جائیں۔ اور سیکڑوں بچیوں اور اُن کے والدین اور بھائی بہنوں کو صدمہ پہنچا کر آخر میں ”حسن انتخاب“ تک پہنچیں۔ انہی لوگوں نے معاشرے میں نسبت سے پہلے دُور دُور رشتوں کو دیکھنے اور انٹرویو لینے، بلکہ تعلقات کا ایک دور گذارنے کا رواج بد پھیلایا ہے۔ اس رویے کی بنیاد جس حدیث پر رکھی جاتی ہے اُس کا منشا یہ ہے کہ نسبت ہوجانے پر ایک نظر دیکھ لینے کی اجازت ہے۔ اور اس کا مقصد ازدیاد محبت ہے اس کے علاوہ جو مطلب لیا جارہا ہے وہ رسولِ خدا کی بات نہیں ہے۔

گھر کے بڑوں اور بچوں کی سالگرہوں کا سلسلہ سال بھر چلتا ہے۔ دوچار تقریبیں ہوجاتی ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ وہی لباس و آرائش کی بہار اور وہی دعوت و میزبانی۔ اس کے ساتھ تحائف کا سلسلہ چلتا ہے۔ کئی سرکاری افسروں کو تو ماہرینِ فن اسی بہانے سے رشوتیں ادا کرتے ہیں۔

---

[1] میرا خیال یہ ہے کہ ہم خیال خادمانِ دین جہاں کہیں بھی ہوں، مل بیٹھیں اور مستقلاً یہ ضابطہ کرلیں کہ ایسی مسرفانہ اور نمائشی تقریبوں میں وہ شرکت نہیں کریں گے ــــ خواہ وہ خاندان میں ہوں یا دوستوں میں یا کسی اور دائرے میں ــ ایسے موقعوں پر اپنا نقطۂ نظر مضبوط انداز میں بتا دینا چاہیے۔ اس طرح کی اجتماعیت کی قوت اس طوفان کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ورنہ یہ معاشرہ ہم آپ سب کو آہستہ آہستہ بہالے جائے گا۔ ہمیں نہیں تو (باقی بر صفحہ آئندہ)

مختصر یہ کہ ہمارا معاشرہ صرف دولت پرست اور اسراف پسند نہیں، نمائش دولت کا مریض بھی ہے۔ سو روپے آمدنی والا دکھائے گا کہ اُسے ہزار روپے ملتے ہیں۔ اور ہزار والا دکھلائے گا کہ وہ لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ وہلم جرا۔

یہ نمائش دولت اس لیے ضروری ہوگئی ہے کہ اب دولت ہی مرتبے کا معیار ہے۔ اب انسانوں کو ان کی انسانیت، اُن کے اخلاق اور ان کی خدمات کے معیار سے نہیں پرکھا جاتا۔ بلکہ سب سے برتر روپیہ ہے۔ یہ بات آج نئے معنوں میں پوری طرح برحق ہوگئی ہے کہ "زر کسوٹی ہے انسان کی"۔ دوستیاں اور رشتہ داریاں، میل جول اور دعوتیں اب اُن لوگوں میں چلتی ہیں جن کی مالی سطح برابر ہے۔ سائیکل والا سائیکل والے کے ساتھ، سکوٹر والا سکوٹر والے کے ساتھ، موٹر والا موٹر والے کے ساتھ اور دو بسی والا دو بسی والے کے ساتھ چل سکتا ہے اور ربط رکھ سکتا ہے۔ بڑے سے بڑا جذبۂ اسلامی بھی لوگوں کو اجتماعات میں تو اکٹھا کر سکتا ہے، مگر مختلف سطحوں کے افراد کے درمیان ذاتی دائرے میں برادرانہ اور دوستانہ ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکتا۔ کسی عالم یا ادیب یا نیک نہاد آدمی کا معاشرے میں کتنا سا احترام کرتے ہوئے لوگ چار تعریفی جملے کہہ دیں گے، لیکن حقیقی قرب مالی معیار کے مطابق ہی رکھیں گے اور حقیقی احترام مالی برتری ہی کا کریں گے۔

بنابریں معاشرے میں نمائش دولت کا رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے۔ ہر شخص اس بات کو ثابت کرنے کے درپے ہے کہ میں امیر کبیر آدمی ہوں۔

بھارت سے آنے والے غیر مسلموں اور مسلمانوں دونوں نے ہماری زندگیوں کی یہ بہار دیکھی تو ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) ہمارے سامنے ہمارے اہل و عیال کو کسی قدر زور لگائے بغیر چارہ نہیں۔

خادمانِ دین کو سادہ تقریبات کی اعلیٰ اور روشن مثالیں قائم کرنی چاہییں جن کی تقلید کرنے کا جذبہ دوسروں میں بھی پیدا ہو۔ تب اگر ہم مسرفانہ رسمداریوں کے خلاف تبلیغ و تلقین کریں گے تو وہ بہت اثر انگیز ہوگی۔ یہ ایک بڑا مغالطہ ہے کہ اس طرح کی تقریبیں منعقد کرکے یا اُن میں شریک ہو کر ہم دین یا سیاست کی کوئی خدمت کر سکیں گے۔ دین کی خدمت کسی مخالفِ دین ماحول میں نہیں ہو سکتی اور نہ لوگوں کی سیاسی آرا اس طرح بدل سکتی ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے آپ الگ سے لوگوں کو کسی ضیافت پر یا ضیافت کے بغیر جمع کرتے رہیے۔ آخر دولت پرستی اور نمائش و اسراف و دولت کی سرپرستی کی کیا ضرورت؟

منہ کھلے کے کھلے رہ گئے کہ پاکستان نے تو بڑی ترقی کی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ بھارت کی حکومت لوگوں کے لیے معمولی گذر بسر کی گنجائش دے کر قومی دولت کا بڑا حصہ صنعت، تجارت، زراعت اور دفاعی ضرورت پر خرچ کر رہی ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہم پشتینی نواب ہیں اور شاہانہ مزاج کے لوگ ہیں۔ جو آیا سو چٹ اور جو ابھی نہیں آیا وہ پیشگی صاف۔

یہ ہے اصل راز ہماری اقتصادی پسماندگی کا، جسے حل کرنے کے لیے ترقی کے فلسفوں اور اقتصادی اسکیموں کے بجائے اسلام کے صرف ایک اصولِ تحدید کو استعمال کرنا کافی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ دولت کمائیے، کاروبار چلائیے، روپیہ جمع کیجیے۔ مگر آپ کسی بھی دائرہ زندگی میں ایک خاص حد سے زیادہ رقم استعمال نہیں کر سکتے۔ بعض چیزیں خرید نہیں سکتے۔ بعض کو رکھ نہیں سکتے، بعض کو درآمد نہیں کر سکتے۔ بعض مقداروں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

اوپر جو معاشرے کی دولت پسندی اور اسراف پسندی اور نمائش دولت کے اطوار کو بیان کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ ہمیں یہاں اقتصادی حالات کا جائزہ لے کر کوئی اسکیم بنانی ہے۔

بلکہ مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ ایسے معاشرے میں رہ کر اس کے افراد تک دعوتِ اسلامی پہنچانے والوں کو (خواہ اُن کا تعلق کسی بھی جماعت یا گروہ یا فرقے سے ہو) کن خطرات سے آگاہ ہونا چاہیے۔

پہلی بات یہ ہے کہ ایسے دولت پرست معاشرے میں اُن افراد کا تناسب کم ہو جاتا ہے جو خدا اور رسول کی بات کو تفصیل سے سُنیں اور سمجھیں اور دین کے تقاضوں کو جانیں۔ حصولِ زر کی دوڑ میں (جسے ریڈیو کے ایک نشریے میں چوہوں کی دوڑ کہا گیا ہے) ہانپتا ہوا انبوہ سرسری جذباتی باتیں سُن کر نعرے لگا سکتا ہے اگر تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھول بھال کر کسی اور نعرے کے لیے بھی گلا پھاڑ سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس دوڑ میں ہانپنے والوں کو ذرا دیر کے لیے سستانے کی دعوت دی جائے اور اُن کا ذہن جب کچھ سکون میں آئے تو پھر "حسن اپنا قصہ چھیڑے"۔

انتخابی جلسوں کا یہ اندازِ گفتگو کافی نہیں ہے کہ واہ وا، ہمارے عوام بڑے اچھے ہیں، اور وہ بس اسلام کے لیے مرمٹنے کو تیار اور اسلامی نظام کی برکتوں کو سمیٹنے کے منتظر ہیں۔ حالانکہ یہ عوام پوچھا کرتے ہیں کہ اسلام آجائے تو وہ ہمیں کیا دے گا؟ تنخواہ اور اجرت میں کتنا منافع ہوگا؟ روٹی،

کپڑے، مکان کے لیے کیا انتظامات؟ وغیرہ - وہ اسلام سے کچھ لینا چاہتے ہیں۔ دینے کے بارے میں انھوں نے آپ سے کبھی سوال نہیں کیا۔

دوسری یہ کہ ایسے معاشرے میں اگر اسلام کے اصول، عادات، قوانین، پردے کے ضوابط یا اخلاقی قدروں کو کوئی حکومت بھی نافذ کرنا چاہے تو دولت پرستی مزاجوں کو اتنا بگاڑ دیتی ہے کہ یا تو وہ دینی تقاضوں سے بغاوت کرتے ہیں یا اگر پابندی کریں بھی تو منافقانہ انداز سے کرتے ہیں اور اُن تقاضوں کے خلاف چہ میگوئیاں اور طنز و تعریض بھی جاری رکھتے ہیں۔ خصوصاً ایسے کمزور عناصر کو تاک کر جب کمیونسٹ اور ملحد اور مغرب پرست لوگ اسلام کے خلاف استعمال کرنا چاہیں تو یہ اُن کے لیے بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ موزوں افراد کو ڈھونڈنے اور اُن پر اثر انداز ہونے کے لیے محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے اور وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ اگر اہلِ دعوت زیادہ وقت اور محنت صرف کرنے اور کم نتیجہ حاصل کرنے کے مشکل عمل سے کترائیں تو غلبۂ دین کی ساری اسکیم کی بنیادیں کمزور رہ جاتی ہیں۔

چوتھی یہ کہ ایسے معاشرے میں بہت سے اہلِ دولت ایسے ملتے ہیں جو اپنی بھاری آمدنی کا ایک فیصد یا ½ فیصد دین کے لیے پیش کر کے محسنِ اسلام بن جاتے ہیں، اور مزے سے اپنی زندگی کی اصل مہم میں مصروف رہتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ غلبۂ دین کی ساری تگ و دو کی ذمہ داری کا بڑا حصہ غریب رضاکاروں کے حصے میں چلا جاتا ہے جو دولت پرست معاشرے میں مہنگی زندگی بسر کرنے کے لیے پوری آمدنی حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ قربانی دے کر بھاری کام کرتے ہیں، مگر دولت پرستوں کا معاشرہ انہیں "مولوی ملا" کہہ کر داد دیتا ہے۔

اب آئیے دوسری جانب!

دولت پرست معاشرے میں اسلام کے جو نقیب کام کرتے ہیں، وہ اسی معاشرے میں رہتے بستے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، رشتے اور تعلقات پیدا کرتے ہیں، ان کے بیوی بچوں کی بھی ایک دنیا ہوتی ہے۔ پس وہ بھی ہزار مزاحمت کے باوجود دولت پرستانہ اور مسرفانہ رجحانات سے بچ نہیں سکتے۔ میں یہاں انتباہاً ان اثرات کا ذکر کرتا ہوں، جو پیدا ہو سکتے ہیں اور پہلے سے ہر شخص کو تحفظ کی فکر

کرنی چاہیے۔

پہلا اثر یہ پڑتا ہے کہ برسوں سے زندگی میں جو واحد غالب نصب العین اقامتِ دین کا کام کرنا تھا۔ اور جس کے لیے ہر دوسرے مفاد کو قربان کر دیا جاتا رہا اور جس کے لیے نقصانات گوارا کئے جاتے رہے، اس کے متوازی دوسرا نصب العین معاشی ترقی کا یا تو برابر کے زور سے کام کرنے لگتا ہے یا اوّلین نصب العین سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بظاہر یہ ناجائز نہیں کہ آپ معاشی کمی کو پورا کرنے اور رشتہ داروں یا ہمسایوں کے برابر آنے کے لیے بہت زیادہ کام کرنے لگیں۔ دو دو تین تین مشغلے پیدا کرلیں۔ گھر کے سارے افراد کچھ نہ کچھ حصہ اس عزم سے ادا کرنے لگیں کہ مل جُل کر اس ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنا ہے تو اوّل نظر میں اس میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی۔ مگر حقیقت میں یہ نقشہ احوال اقامتِ دین کے علمبرداروں کی قوتوں کا بڑا حصہ اِدھر سے نکال کر اُدھر ڈال دیتا ہے۔ معاد کا کام تو معاش کی قربانی سے ہوتا ہے۔ اگر معاد اور معاش دونوں کو برابر کی اہمیت دی جائے تو نصب العین میں ایسا شرک پیدا ہو جاتا ہے جو خدمتِ دین کے لیے نقصان دہ ہے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دُعا سکھائی تھی کہ دُنیا کو ہمارے لیے "ہمِّ اکبر" کا باعث نہ بنا دے۔ اسی معنی میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ کوئی شخص خدا اور دولت کی خدمت بیک وقت نہیں کر سکتا۔ یعنی دونوں میں سے ایک چیز کو اوّلیت و فوقیت دینی ہوگی اور دوسری کو اس کے تابع کرنا ہوگا۔

میں نے کتنے ہی لوگ دیکھے جن کا جذبہ یہ تھا کہ ہم ذرا کچھ مدت محنت کر کے ایک مرتبہ زیادہ بڑی کمائی کرنے لگ جائیں تو پھر خوب دل کھول کر دین کی خدمت کرنے لگیں گے، مگر جب وہ معاشی ترقی کی راہ پر آگے بڑھے تو پیچھے پلٹنا مشکل ہو گیا۔ کام دام تو وہ کیا کر سکتے تھے۔ بس جو ذرا اچھے لوگ تھے وہ چند روپے دین کے لیے خرچ کرنے لگے اور جو کمزور تر تھے وہ "کانِ نمک" میں جا کر نمک ہی بن گئے۔

؎ کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

مجھے کوئی ایسا دولت بڑھانے والا نہیں ملا جس نے اپنے اضافۂ دولت یا اس کے بڑے حصے کو عزائم کے مطابق اپنے اور گھر والوں کے مطالبات کی زد سے محفوظ رکھ کر خدا کی راہ میں خرچ کرتے رہنے کی نظیر قائم کر دی ہو۔

اپنے واحد نصب العین سے وابستگی اور اس کی برتری کا اندازہ کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اوقات، قوتوں اور قابلیتوں اور دولت کا کتنے فیصد حصہ دین کی خدمت کے لیے صرف ہوتا ہے، اور یہ حصہ دولت افزائی کی مہم سے پہلے کتنا ہوتا تھا۔

جن لوگوں کو کوئی بڑا کام کرنا ہوتا ہے ——— اور دین کے کام سے بڑا کام کونسا ہوگا ——— وہ دنیوی اُمنگوں اور حوصلوں اور بہت سے رنگین خوابوں کے شیشہ خانے توڑ کر بیڑا اُٹھاتے ہیں۔ دین کی سربلندی کا کام اتنا جزوی اور ضمنی قسم کا نہیں ہے کہ بس اپنا سب کچھ اور اطراف میں کھپانے کے بعد چند لمحے اِدھر بھی صرف کر دیئے، دس باتیں اِدھر بھی کہہ لیں، اور چار پیسے اِدھر بھی خرچ کر دیئے۔

دوسرا اثر یہ پڑتا ہے کہ آدمی دین کی روشنی میں اپنے طے کردہ اور اختیار کردہ اصولوں اور ضابطوں کی پابندی میں آہستہ آہستہ ڈھیلا ہونے لگتا ہے، کیونکہ "دولت دنیا" اپنی قیمت ضرور وصول کرتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں جواز کی راہیں تلاش کرتا ہے، حالانکہ اولاً خدمتِ دین کی راہ میں اچھے لوگوں کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کرید کرید کر ناجائز چیزوں کو زندگی سے خارج کرتے ہیں۔ آدمی ہر طرف سے مجبوریوں اور اضطراریوں میں گھرتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ اخلاقی معیار مدہم رفتار سے درہم برہم ہونے لگتا ہے جس کے بغیر دعوتِ اسلامی کا کام کما حقہٗ نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا اثر دولت افزائی کی پُرزور سرگرمیوں کا آدمی پر غیر شعوری طور پر یہ پڑتا ہے کہ وہ بھی دوستیوں اور رشتہ داریوں کے لیے مالی ہم سری کو بنیاد بناتا ہے۔ تعلقات دوسروں سے بھی ہوتے ہیں مگر واجبی حد تک۔ حقیقی محبتیں اور احترام اور بے تکلفانہ رابطے ایک خاص دائرے سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ رشتوں کے معاملے میں حدیث نبویؐ کی ہدایت کے بخلاف پہلی صفات جو دیکھی جانے لگتی ہیں وہ دولت اور صورت ہیں۔ دولت بسا اوقات صورت سے بھی آگے چلی جاتی ہے۔ دینی پہلو سے اتنا کافی سمجھا جاتا ہے کہ لڑکا شریف ہے، کسی مذہب دشمن گروہ سے تعلق نہیں رکھتا یا نماز روزہ کر لیتا ہے۔ میرے سامنے ایسی مثالیں کم ہیں کہ لوگ سب سے پہلے دینی پہلو سے جانچیں اور اُسے پوری اہمیت دیں، اور باقی چیزوں کو بعد میں۔ نہ ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی نے محض اس لیے دولت مند گھرانے کو مسترد کر دیا ہو کہ لڑکا یا لڑکی یا اس کا گھرانہ دینی لحاظ سے پھسڈی ہے۔

اسی طرح یہ بھی شاید ہی کہیں ہوتا ہو کہ کسی غریب کے رشتے کو محض اس لیے ترجیح دی جائے کہ وہ دینی معیار کے لحاظ سے افضل ہے۔ یعنی اگر دو باتیں آمنے سامنے رکھی جائیں کہ ایک طرف "دولت جمع تھوڑی سی مذہب داری" ہے اور دوسری طرف غریبی (یا معتدل گزر بسر) کے ساتھ مضبوط اہتمامِ دین ہو تو ہمارے ملک کے دینی حلقوں میں بھی بالعموم پہلی صورت کو ترجیح دی جائے گی، اور دوسری صورت شاذ ہی کہیں ملے گی۔ حتیٰ کہ دوسری صورت میں اچھی خاصی تعلیم کا ہونا بھی زیادہ فرق نہ پیدا کرے گا۔ ہاں غریب گھروں کے لوگ دوسری صورت کو اس لیے قبول کر لیں گے کہ وہ خود غریب ہیں۔

چوتھا فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ لذات اور آسائشوں کے لحاظ سے اپنے مرتبے کو بلند کرنے کے بعد خدمتِ دین کی سرگرمیوں میں کمی آجاتی ہے اور خصوصاً عوام کی سطح پر تکلیف دہ کام کرنے میں آدمی پھسڈی ہو جاتا ہے۔

پانچواں فرق یہ کہ آسائشوں میں گھرا ہوا انسان دین کے اعلیٰ مقصد کو محبوب بنا کر دشت پیمائیاں اور کوچہ گردیاں نہیں کر سکتا۔

چھٹا فرق یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مضبوط ایمان اور دینی شعور موجود نہ ہو تو بسا اوقات ایک مذہبی آدمی کے دل میں مالی لحاظ سے پیچھے ہونے کی وجہ سے ایک احساس کمتری ایسا گھر کرے گا کہ کماحقہ اثر انداز نہ ہو سکے گا۔ حالانکہ اس معاشرے میں دینی لحاظ سے فرومایہ لوگوں کو اپنے ایمانی و اخلاقی افلاس کی وجہ سے کوئی احساس کمتری لاحق نہیں ہوتا۔

اختصار کا تقاضا ہے کہ استقصا نہ کیا جائے۔ اِن اشارات سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دولت پرست مسرفانہ معاشرے میں کام کرنے والے محبانِ دین کے لیے بھی کتنے خطرات ہیں۔ وہ دوسروں کو طوفان میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے خود بھی حوالۂ طوفان ہو سکتے ہیں۔ ورنہ تر دامنی تو کہیں گئی نہیں۔

ان خطرات سے بچنے کے لیے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو ہدایات دی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:-

— اچھا مسلمان وہی ہو سکتا ہے جو رزقِ کفاف پر اکتفا کرے (اور بقیہ وقت خدا کی عبادت

دین کی سربلندی اور انسانوں کی فلاح میں صرف کرے۔

——— اسلام پر چلنے والوں کو اس تصور کے مطابق دُنیا سے معاملہ رکھنا چاہیے کہ وہ یہاں محض مسافرانہ حیثیت سے گھڑی دو گھڑی کے لیے وارد ہیں۔ منزل تو آگے ہے۔

——— معاشرے میں دولت کی افراط ایمان کے لیے آزمائشیں اور لوگوں کے درمیان نزاعات اور سازشیں بڑھا دیتی ہے، لہٰذا ایسا وقت آنے کے متعلق حضورؐ نے تشویش کا اظہار فرمایا۔

——— زائد آمدنی و دولت کا مصرف انفاق فی سبیل اللہ بتایا۔ یعنی اُسے اللہ کے دین کو غالب کرنے اور اس کے مصیبت زدہ بندوں کو سہارا دینے کے لیے استعمال کیا جائے۔ حضورؐ نے اُخروی حساب سے نجات کی راہ ہاتھوں سے اشارہ کر کے یہ بتائی کہ وہاں وہ بچے گا جو اِس طرح اور اِس طرح دولت کو چاروں طرف (دین کی سربلندی اور بندوں کی بھلائی کے لیے) لٹاتا پھرے۔ چنانچہ ہماری تاریخ میں یہ مثالیں پیدا ہوئیں کہ لاکھوں اشرفیاں پاکر ایک شخص دو منٹ میں دوسروں میں تقسیم کر دیتا ہے اور ایک دوست دوسرے کی مشکلات کا خیال کر کے اپنا مال اُسے بھجوا دیتا ہے۔

——— تعلیم یہ دی کہ دنیوی جاہ و مال کے معاملے میں مسابقت نہ کی جائے، اور کوئی اپنے آگے والوں کو دیکھ کر اُن کے رشک میں پڑنے کے بجائے اپنے سے پیچھے رہ جانے والوں کی مصیبتوں کو دیکھے اور خدا کا شکر ادا کرے۔

——— یہ نصیحت بھی فرمائی کہ خادمانِ دین کو پہلے ہی دن یکبارگی ان تمام عمارات، ساز و سامان اور غیر ضروری آسائشوں اور آلائشوں سے اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے مایوس کر لینا چاہیے جو اُسے دوسروں کے پاس دکھائی دیتی ہیں۔ فیصلہ کر لے کہ میں اِن چیزوں کے لیے نہیں تڑپوں گا۔ قرآن مجید میں بھی آیا کہ منافقین یا مغفلین کی دولت و زینت کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں مرعوب نہ ہونے پائیں۔

——— آمد و صرف کے تمام حرام اور ناجائز راستوں کو اپنے اُوپر ہمیشہ کے لیے بند کر لینا چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ تفصیل میں جانا ضروری نہیں، کیونکہ حضورؐ نے صرف یہ نصائح ہی نہیں فرمائیں بلکہ سب کچھ ہوتے ہوئے تنگی ترشی کی درویشانہ زندگی گزار کر دکھا دیا کہ صحیح رویہ کیا ہے۔ بعض حضرات کا یہ کہنا کہ درست بھی ہو کہ حضورؐ کا مقام عام اُمتیوں سے ارفع ہے تو میں حضورؐ ہی کے تیار کردہ صحابہ کی وسیع سوسائٹی کو سامنے رکھ کر کہوں گا کہ آپ حضرت ابوذرؓ اور اصحابِ صُفّہ سے لے کر

حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تک سب کو دیکھ جا یئے ۔کسی نے ذاتی زندگی کو عالیشان بنانے کی کوشش نہیں کی ۔بلکہ دولت مندوں نے بھی اپنی دولت کو ہمیشہ خدا کے دین اور خدا کے بندوں کی خدمت کے لیے استعمال کیا ۔

اتنا ہی نہیں ، اُمت میں جب بھی کوئی انقلابی کام کرنے والا اٹھا اور جن مبلغین اور صوفیا نے خدا کا پیغام پھیلانے کی مساعی کیں ، ان کی بیشتر تعداد نے ہمیشہ فاقہ مستی اور سادہ معاشرت کے ساتھ کام کیا ، اور ان کے کام کے نتائج آج آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں ۔ ہمارے اپنے اس خطے میں تحریک مجاہدین ابھی کل جاری رہ چکی ہے ۔ اس کے متوسلین ، اور خصوصاً اس کے قائدین (خدا اُن پر انعام فرمائے) نے سادہ ہی نہیں سخت کٹھن زندگی گذاری ۔نتیجہ یہ کہ ظاہری شکست کے باوجود تاریخ پر اتنا گہرا اثر چھوڑ گئے کہ بعد میں تمام تحریکات میں اُن کی رُوح کچھ نہ کچھ شامل رہی ۔ آج کی تازہ مثال امام خمینی کی ہے کہ وہ شخص جو کروڑوں افراد کے دلوں پر حکومت کرتا ہے اُس کا رہن سہن اور رکھ رکھاؤ کیا ہے ۔

آج کے عقلی دور میں کچھ دوست یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو دین کا اخلاقی پہلو ہے ۔میں جواب میں کہوں گا کہ خدا اور رسولؐ نے اخلاقی ہدایات بھی محض سفارش کے طور پر نہیں دی ہیں ، بلکہ وہ بھی ایک قانون ہے ۔فرق صرف اتنا ہے کہ اس قانون کو رضا کارانہ جذبے سے تسلیم کرنے کا مطالبہ ہے ۔جس نے تسلیم نہیں کیا ، وہ یہ نہ سمجھے کہ اس سے کوئی مطالبہ ہی نہ تھا ۔اپنے اخلاقی پہلو کے استحکام کے بغیر دین کا قانونی نظام بھی کام نہیں کر سکتا ۔ دولت کو اگر کوئی شخص خدا کی امانت سمجھ کر آمد و خرچ کے ایک ایک پیسے پر کڑی نگاہ نہیں رکھتا تو اُسے جاننا چاہیے کہ لَتُسْئَلُنَّ عَنِ النَّعِيمِ ۔مال کے متعلق اس سوال کا جواب دینا پڑے گا کہ اَيْنَ اكْتَسَبَ وَفِيمَ اَنْفَقَ ۔

ذرا غور فرمایئے کہ ایک شخص بھوکوں مرتی ہوئی آبادی کے سامنے ٹھاٹھ دار دعوتیں اور ضیافتیں کرتا ہے ، نکاح کے سادہ سے معاملے کو دھوم دھام کی تقریب بنا ڈالتا ہے ۔مکان ، فرنیچر ، لباس ، کراکری ، تین تین کاروں ، قالینوں اور دوسری غیر ضروری ضروریات پر لاکھوں روپے اُڑا دیتا ہے تو کیا وہ خدا کے ہاں یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا کہ دولت میری اپنی تھی اور میں نے اپنے قانونی حقِ ملکیت کو استعمال کیا ہے ۔ ہرگز نہیں ۔ایک پیسہ بھی جب ہم "غیر ضروری ضروریات" پر خرچ کرتے ہیں ، جبکہ

ایک طرف خدا کا دین ہم سے مطالبۂ ایثار کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف غربت زدہ قوم کی اکثریت اپنا حق مانگ رہی ہوتی ہے تو یہ نہیں سمجھنا کہ اُس پیسے کا خرچ محض اس لیے جائز ہے کہ قانون نے کسی شخص کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ اگر کسی معاشرے کے تمام لوگ اس طرح سوچنے لگیں تو پھر تو اسلام کے اخلاقی تقاضوں کو بھی قانون کی قوت سے نافذ کرنا پڑے گا۔

آخر کوئی گروہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ جو دولت پرستی اور اسراف پسندی کے طوفان سے اپنا سر اُوپر اُبھار کر دوسروں کو بہتری کی تلقین کر سکے اور معاشرہ جس اضطراب افزا بیماری میں پڑ گیا ہے، اس سے نکالنے کے لیے کوشش کر سکے۔ سیاسی طور پر یہ فریضہ حکام و افسران اور لیڈروں پر عاید ہوتا ہے۔ لیکن مَیں زور دوں گا کہ اِس کا زیادہ بار اہلِ دین کے سر آتا ہے اور وہ اگر پورا زور لگائیں تو معاشرے کو دولت پرستی کے گھن چکر سے نکال سکتے ہیں لیکن جہاں علما اور حکام خود ہی حبِّ دولت کے رام ہو جائیں، وہاں عوام کی چارہ گری کون کرے۔

دین کی خدمت جبھی ممکن ہے کہ آدمی زندگی کا مرکزی اوّلین نصب العین فروغِ دین ہی کو قرار دے۔ دُنیوی لحاظ سے مطمحِ نظر رزقِ کفاف کو رکھے، زائد ملے تو اُسے خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔ اس معاملے میں اعلیٰ درجے کا معیار، اگر نہیں تو کسی درجے کا معیار تو ہونا چاہیے۔ یہ امر طے کر لینا چاہیے کہ ہم کسی معاملے میں فلاں لکیر سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ اگر کوئی لکیر نہ ہوگی تو پھر آدمی دُنیا طلبی کی راہ میں قدم بقدم آگے ہی بڑھتا جائے گا اور اس کا نتیجہ دعوتِ حق کے پھیلاؤ میں کمی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

خدا کے لیے ازدیادِ دولت کی مہمات اور نمائشِ دولت اور حب الشہوات کے اصر و اغلال کو اُتار پھینکیے، اور میخانۂ اسراف کی سرمستیوں سے نکلیے، پھر آپ خود بھی خدا سے قریب ہو سکیں گے اور اس کے بندوں میں خدا کی دعوت کو مؤثر بھی بنا سکیں گے۔

مطلوب یہ نہیں کہ آپ نِرے سادھو اور مہنت ہی بن جائیں۔ بس ایسا جادۂ اعتدال اختیار کریں کہ کچھ نسبت ماضی کی درخشاں مثالوں سے بھی رہے، اور موجودہ حالات میں پنپنے کی بات بھی بنی رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

کے خلاف

ذاتی اور شخصی، مذہبی اور سیاسی الزامات کا تجزیہ

مولانا مودودیؒ پر جھوٹے الزامات

اور

اُن کے مُدلّل جوابات

تالیف

عاصم نعمانی

•

• سائز: ۲۰×۳۰/۱۶ • ضخامت: ۱۲۸ صفحات • قیمت: پانچ روپے

•

ناشر: مجلس احباب، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

•

ملنے کا پتہ

- ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور • مکتبہ تعمیر انسانیت۔ اردو بازار لاہور
- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور • بین اسلامک پبلشرز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
- ادارہ مطبوعات طلبہ، اچھرہ، لاہور • شیخ فقیر حسین صاحب، منصورہ ملتان روڈ لاہور
- مکتبۂ افکارِ اسلامی، بازار شاہ فیصل شہید، راولپنڈی • البدر بک کارپوریشن، صدر، کراچی۔